عالم خیال



مصنفہ

مولانا احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی

عالمِ خیال

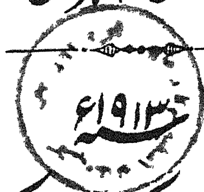
ایک بے اضافت و بے بدل نظم

(بر چہار رُخ)

مصنّفہ

مولانا احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی

مصنّف ترانۂ شوق، قاسم و زہرہ، لیل و نہار وغیرہ



سنہ ۱۹۱۳ء

منروا پبلشنگ کمپنی لکھنؤ نے چھپوا کر شائع کیا

حضرت شوقؔ قدوائی کی دیگر تصنیفات



مُقدّمہ

عالمِ خیال کے نام سے لطیف نظموں کے چار رُخ ہندوستان کے مشہور سحر بیان حضرت منشی احمد علی صاحب **شوق** قدوائی، لکھنوی کی تصنیفات سے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، جنکو اب کتابی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

چاروں رخوں پر چار ریویو بھی نکلے ہیں اور ہر ریویو اپنے رُخ کے ہر حُسن کو سخن فہموں کی نگاہوں کے سامنے یوں پیش کر رہا ہے جس طرح آفتاب دنیا کی چیزوں کو نظارے کے روبرو پیش کر دیتا ہے۔ نظموں کے چار رُخ اور اُن پر چار ریویو: آٹھوں کے مجموعے کو میں اس ریویو کے دامن میں سمیٹ رہا ہوں۔ اسی رعایت سے اس کا نام میں نے "ہشت خلد" رکھا ہے۔

نظمیں کس پائے کی ہیں؟ اس کا جواب طرزِ بیان کی سلاست، بندشوں کی نفاست زبان کی فصاحت مضامین کی جدت، فطری جذبات کی کثرت، غرض اصنافِ سخن میں جتنی خوبیاں اور اُن خوبیوں میں جتنی دل فریبیاں داخل ہیں اُن سبھوں کی مجموعی ہئیت

اتنی شہادتیں دے رہی ہے کہ ان کو لاجواب تسلیم نہ کرنا سخن فہمی کی فطرت میں انصاف کا
خون کرکے دماغ اور دل کو ظلم کا مجرم بناتا ہے۔

ارسطو کا قول ہے کہ وہ حکیم نہیں جو شاعر نہ ہو، شاعر نہیں جو قدرت کے مناظر اور
فطرت کے جذبات کو سطروں میں نہ جکڑے، شعر نہیں جو اثر کے جادو سے دلوں کو مسخر نہ کر
سکے۔ اخلاق اگرچہ کوئی منظوم آئین نہ ہو سکے، مگر یقین جز و نصیب۔ اس حق سے حضرت شوق
نے ان کو مشہور و معروف بنا دیا، ان کی نظمیں فلسفیانہ خیالات سے اس طرح بھری ہوتی ہیں جس طرح
فضائے بسیط ایتھر (وہ مادہ جو حرارت حیات کا منبع ہے) سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی نظموں
کو دیکھ کر فلسفہ شاعری کا یہ کلیہ تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ شاعری اور فلسفہ دونوں ایک مادر
طبع کے بطن کی دختران توام ہیں۔ تمام خیال ہی کی دل فریب نظموں کو دیکھئے فلسفہ
اخلاق اور فلسفہ معاشرت انسانی سے کس قدر آراستہ ہیں۔

فارسی میں شاعری کی جامع تعریف شاید نہ ملے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مختلف
اقوال کو یکجا کرکے ایک نتیجہ نکال لو۔ البتہ انگریزی کے شعرا نے مختصر الفاظ میں اس کی ایسی
تعریف کی ہے جس کو جامعیت کے لحاظ سے انسان کا دماغ کہنا چاہیے۔ مجموعہ پر پہنچو تو
شاعر ہونے کو تمام عالم کے خیالات کا مرکز ہے۔ مشہور انگریزی شاعر شیلی کہتا ہے
کہ شاعری فطرت کی مخفی دلفریبیوں کے چہرے سے نقاب الٹ دیتی ہے اور اس کے
جذبات کا ہمارے دلوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ جس شے سے ہم کو انس نہ ہو اس سے بھی انس
پیدا ہو جاتا ہے۔ ملٹن کہتا ہے سب سے زیادہ نظم کی خوبی یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے

الفاظ میں اور نازک خیالوں کے ساتھ۔ باثر ہو۔ حضرت شوق قدوائی کی نظمیں فلسفہ، سائنس، سینری، نیچر کے کسی مذاق پر ہوں، اور عالم خیال کے چاروں رُخ جو اخلاق اور معاشرت کے دلفریب نقشے نظارے کے سامنے کھینچ رہے ہیں، ان پر شبلی اور ملٹن کے اصولِ شاعرانہ سے نگاہیں ڈالی جائیں تو سب تعریفیں اس طرح ٹھیک اُتر جائیں گی جس طرح اُستاد خیاط کا سیا ہوا خوش نما لباس کسی حسین کے جسم پر ہر پہلو سے ٹھیک اُتر جاتا ہے۔

انسان کا کوئی خیال دو حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ یا وہ محسوسات خارجی کے دائرے میں رہے گا یا داخلی کے۔ انھیں دو حدوں میں شاعری بھی محدود ہے۔ خارجی سے دل پر کم اثر پڑتا ہے، اور داخلی سے دلی جذبات متحرک ہو کے رگ و پے میں اس طرح دوڑ جاتے ہیں، جسطرح بجلی کا اثر جسم میں دوڑ کے محسوسات انسانی پر حاوی ہو جاتا ہے۔

اب تم عالم خیال کی دلکش نظموں کو دیکھو۔ ان کے ظروف میں حضرت مصنف نے محسوسات داخلی کو اس کثرت کے ساتھ بھر دیا ہے کہ اُن کے جذبات ہر طرف چھلکے پڑتے ہیں اور فطرت کی دل فریب ادائیں جو حُسن معاشرت کو آغوش میں دبائے ہوئے ہیں، اپنی کششوں سے قوتِ مدرکہ پر بجلی کا اثر ڈال رہی ہیں۔ گویا خیال کے سامنے اداؤں کی ایک شکل مجسم کھڑی ہے جس کا حُسن دل کو اسطرح کھینچ رہا ہے جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔

فلسفۂ شاعری یہ قرار دیتا ہے کہ سخن سنجی وہبی ہے۔ بیشک وہبی ہے۔ مگر موزونی طبع وہبی ہے اور کمال فن کسبی۔ بعض جاہل بھی موزوں طبع پائے جائیں گے۔ وہ شعر کہہ لیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ قلمرو سخن پر قبضہ کر کے اپنا سکہ بٹھا سکیں۔ اُن کا کھوٹا سکہ اکثر ٹکسال باہر

نظر آئے گا۔ وہ ارادہ کرے مضامین کی جدّت، خیالات کی نزاکت، الفاظ کی سلامت، بیانات کی وسعت، اور جذباتِ فطرت نہیں پیدا کر سکتے۔ اُن کی شاعری نہ تو موقع کی مناسبت سے فصاحت پر قابو رکھتی ہے نہ بلاغت پر۔ اُن کی سخن آفرینی جنگل کے خود رو پیڑ سے مشابہ ہوگی جس کی تربیت نہ ہو، اور جا بجا کجی اور ناہمواری کے عیوب سے بدنما نظر آئے۔ اسی بنا پر اعلیٰ درجے کے قابل اور بلند پایہ سخن فہم مسٹر مشیر حسین قدوائی، بیرسٹر ایٹ لا نے عالم خیال کے پہلے رُخ پر جو ریویو لکھا ہے اس میں یہ بات بھی ظاہر کی ہے کہ "زمانے کے رنگ کے ساتھ اُردو شاعری نے بھی۔ طرز بدلی[1]۔ گو اس نے پہلے رکیک شعرا پیدا کیے مگر پھر حضرت شوق قدوائی کے سے قادر الکلام اُستاد بھی نکالے جن کی نظمیں "حسن[2]" اور "عالم خیال" کے ناموں سے شاعری کی دنیا کو محو کر چکی ہیں"۔

میرا منشاء اس جملے کے لکھنے سے یہ ہے کہ طبع کی موزونی جس کو فلسفہ سخن وہبی قرار دے چکا ہے اُس کو یہ قدرتِ کلام جو حضرتِ شوق کی دل کش نظموں میں نظر آ رہی ہے بغیر اکتساب اور تکمیل فن کے نہیں حاصل ہو سکتی۔

جس طرح شاعری کو مصوّری سے تناسب ہے اسی طرح موسیقی سے بھی، اور جس طرح موسیقی سے جذبات روحی جنبش میں آتے ہیں اسی طرح اشعار سے بھی۔ یہ بھی ایک فلسفیانہ تناسب ہے جو علمائے فن نے قائم کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصوّری کی نقاشی اور

---

[1] اس فقرے کا یہ مطلب ہے کہ انگریزی علم ادب کا مذاق پھیلا تو اُردو میں جذبات و محسوسات فطری کی جانب شعرا کے خیالات مائل ہوئے [2] یہ ایک جداگانہ نظم ہے جو نہایت ہی لطیف ہے۔

موسیقی کا تلذذ روحی دونوں اوصاف شاعری مین موجود پاے جاتے ہین۔ دیکھو اخیال جو خود بھی مصور ہے اُس نے شاعرانہ قلم سے عالم خیال میں وہ وہ نقاشیاں کی ہیں کہ عورت اور مرد کے محسوسات فطری اور جذبات دلی تصویروں کے لباس میں پڑھنے والے کے سامنے آجاتے ہیں، اور اُن سے حسِ باطنی کو ویسا ہی تلذذ روحی حاصل ہوتا ہے جیسا موسیقی سے۔

شاعری کی بحث میں اشعار کے قوی الاثر ہونے کی نسبت کارلائل کا یہ قول بہت صحیح ہے کہ اگر خیالات کا اظہار سچے پیرائے میں نہیں ہوتا تو اشعار کا اثر دیر تک نہیں قائم رہتا۔ مین سچے پیرائے کی شرح یہ کرتا ہوں کہ اس تعریف کا انحصار کچھ چشم دید حالت پر نہین ہے بلکہ ہر ایسا بیان جو فطرت کے سانچے میں ڈھل جاے، با اثر اور دیرپا ضرور ہوگا۔ عالم خیال کے چوتھے رُخ میں اظہار شکر رنجی کے لیے عورت کی دلفریب اداؤن کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ چشم دید نہیں ہے، مگر ایسا ہے کہ گویا آنکھوں کے سامنے سچّی اداؤں کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ اسی دلچسپی سے اس نظم کا اثر دل سے ایسا لپٹ جاتا ہے کہ ہٹائے نہیں ہٹتا۔

عالم خیال کے چاروں رخوں پر چار ریویو اس تفصیل سے نکلے ہیں:۔

(۱) پہلے رُخ پر مسٹر مشیر حسین، قدوائی، بیرسٹر ایٹ لا کا ریویو

(۲) دوسرے رُخ پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا کا

(۳) تیسرے رُخ پر سید مقصود علی اسیونی کا

(۴) چوتھے رُخ پر سید شبیر حسن مجسٹریٹ بھوپال کا

انگریزی علم ادب کے اعتبار سے میں دونوں قابل بیرسٹروں کی محققانہ نگاہوں کو مغربی شاعری کی دنیا میں بہت وسیع پاتا ہوں۔ اور اُردو کے اعتبار سے بزم سخن فہمی میں چاروں برابر کی کرسیوں پر نظر آرہے ہیں۔

پہلا رُخ ہندوستان کی ایک ایسی جوان، مگر دل شکستہ، عورت کے قلبی محسوسات اور باطنی خیالات کا مجموعہ ہے، جس کا شوہر پردیس میں ہے، اور اُس کی یاد میں محو، اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے۔

بعض ناواقف جو انسانی فطرت کا مذاق نہیں رکھتے، وہ حیاتِ انسانی کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتے، اور اُس کو نہیں سمجھ سکتے تو جذبات قلبی تک ان کی قوت مدرکہ کی رسائی معلوم! اُن کی نظر فہم کی دنیا میں دل اور زبان کا فرق نہ دیکھ سکے تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیئے اُن کا ہمزبان صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو بصارت کے نہ ہونے سے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھ سکے حضرت قدوائی بیرسٹر نے اپنے ریویو میں فطرتِ انسانی پر نہایت قابلیت کے ساتھ فلسفیانہ بحث کرتے کرتے ایسے ہی نابیناؤں کی نسبت یہ فقرہ نہایت معقول تحریر فرمایا ہے کہ وہ انسانی عالم خیال کے فلسفہ سے نابلد محض ہیں۔

ان نظموں کے ضمن میں فطرت انسانی کا فلسفہ روح جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے۔ مگر میں اس ریویو میں اُس پر بحث اور اس کی تشریح اس سبب سے نہیں کروں گا کہ مُنہ خیال میں مسٹر حضرت قدوائی نے اپنے ریویو میں نظم کے تسلسل کو دکھاتے ہوئے اخلاق اور معاشرت کے

فلسفیانہ خیالات کو ایک دوسرے کے بعد سلسلہ بیان میں اس طرح دکھا دیا ہے جس طرح
کوئی موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کے لڑی کو آنکھوں کے سامنے رکھ دے؛ اور پھر قابل
بیرسٹر مسٹر محمد سلیمان نے بھی اپنے ریویو میں جابجا فطرت انسانی کے فلسفہ پر مناسب اور
معقول بحث کر دی ہے۔ یہ دونوں جواہر نگار تنقیدی نظروں کے چمکانے کو کافی ہیں۔

دونوں قابل بیرسٹر علم ادب کے وسیع میدانوں میں جستجو اور تحقیق کی نگاہوں کو
دوڑا کے اس امر پر اتفاق کر چکے ہیں کہ اردو درکنار یورپ کی زبانوں میں بھی عالم
خیال کی سی دلفریب اور مسلسل نظمیں جنمیں فطرتِ انسانی کے جذبات بھرے ہوں کہیں
نہیں ہیں۔ یہ فیصلہ صحیح ہے۔ شیکسپیر نے جذبات کے نقشے کھینچے ہیں؛ لیکن نہ ایسے مسلسل
اور نہ عورت اور مرد کے پاکبازانہ برتاؤ اور حصر محبت کے ساتھ۔ حضرت شوق قدوائی کے
کمال سخنوری پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا کا یہ فقرہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے کہ
مرد کا قلم عورت کا دل بن کر بول رہا ہے۔ اس سے زیادہ کمال فن اور قدرت کمال
کی بلیغ تعریف نہیں ہو سکتی۔

فطرتِ انسانی کا فلسفہ ایسا نازک ہے کہ اس کا رستہ چلنے والا بغیر کافی علم اور
ذاتی تجربے کے اگر لوگ غلط فہمی کے خارزار میں الجھ جائیں تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے۔ اگر حضرت
قدوائی بیرسٹر یورپ اور ایشیائی عورتوں کا فلسفیانہ موازنہ کر کے یہ ثابت کر دیا
ہوتا کہ میزانِ فطرت میں دونوں ملکوں کی عورتوں کے خیالات انسانی کا وزن برابر ہے
تو شاید بعض لوگ عالم خیال کو دیکھ کر فطرت انسانی کے سیدھے راستے سے بہک جاتے

بلاشبہ فطرت انسانی ایک ہی سی ہے۔ اگر سوسائٹی کا اثر طرزِ معاشرت میں فرق پیدا کر دے تو وہ فطرت کا اختلاف نہیں ہے بلکہ تعلیم، تمدن اور ترکیب بود و باش نے دونوں کی رفتار زندگی کو دو مختلف راہوں پر ڈال دیا۔ اس حالت کو ہم طبیعی نہیں کہہ سکتے دیکھو! ہندوستان کی شریف عورت، جس کو سوسائٹی کا غلبہ طرزِ معاشرت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے حجاب کی کوٹھری میں بند رکھتا ہے، اور جو بیوہ ہو جانے پر عقد ثانی کے خیال کو بھی بڑا گناہ سمجھتی ہے، اس کی زندگی کے سامانِ آسایش اور اسبابِ زیبایش کا دار و مدار صرف اسی شوہر پر ہے جس نے عقد کے ذریعے سے طرزِ معاشرت کی دنیا میں سوسائٹی کے ہاتھوں اس کا اقراری پٹا حاصل کر لیا۔ ایسی پاکباز عورت کے جذباتِ قلبی اور خیالاتِ دلی جس قدر اپنے شوہر کی محبت کے ساتھ وابستہ ہیں، اُس قدر کسی ایسے ملک کی عورت کے نہیں ہو سکتے جہاں کی سوسائٹی عورت کو شوہروں کی ورق گردانی میں آزادی دیے ہوئے ہے۔

باطنی وسوسے اور داخلی خیالات خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں، مردوں اور عورتوں کے دلوں پر ایک ہی قوت کے ساتھ قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ ان کی روک ٹوک کے لئے قانون فطرت نے کوئی چوپہرا نہیں قائم کر رکھا ہے۔ شاید یہ کلیہ بلا استثنا ہو اور اس کی شہادت ہر انسان کا قلب خود ہی پیش کر دے۔ جس کو شک ہو وہ اپنے قلب سے پوچھ لے۔

پہلے، تیسرے، اور چوتھے ریویو میں تین سخن فہموں نے اردو شاعری پر بھی مختصر مگر سچی بحث کی۔ یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ایشیا کی عام شاعری بھی آگئی ہے جہاں تک

میں واقف ہوں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ سنسکرت میں کالی داس اور بھاشا میں تلسی داس نے فطری جذبات کے دکھانے میں جادو سے کام لیا ہے۔ یہ دعویٰ میرا ایسا نہیں ہے جس سے سمجھنے والے کو انکار ہو سکے۔ اردو میں بھی میر انیس کے مرثیے فطرت کے نقاشیوں اور جذبات دلکش کی گفتگوؤں سے بھرے ہوئے ہیں لیکن ان سبھوں کی تصنیفات کے متعلق بھی میرے دعوے پر وہی فیصلہ صادر ہو سکتا ہے جو قابل بیرسٹروں نے اپنے اپنے ریویو میں شیکسپیر کی نظموں کے متعلق صادر کیا ہے۔ اُس فیصلے کے ناطق ہونے میں کچھ کلام نہیں، اس لیے کہ عالم خیال کی ہی مسلسل نظم کوئی نہیں ہے، جس میں اخلاق اور معاشرت کو آغوش میں لیے ہوئے پاکباز عورت اور نیک سرشت مرد کے قلبی خیالات اور فطری جذبات ایک دوسرے کے بعد یوں نظر آئیں جس طرح بارش کے پانی کی بوندیں سلسلے کے ساتھ ٹپک رہی ہوں۔

اب میں عربی کی شاعری پر نگاہ ڈالتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ اُسکی قدیم شاعری میں فطرت کا مذاق بھی ہے اور سلسلہ بھی، اگرچہ نازک خیالیاں اس میں کم ہیں۔ عربی کے قدیم شعرا نے مناظر کو نہایت خوبی اور تسلسل کے ساتھ دکھایا ہے۔ مگر اُن کے مناظر کا دائرہ ملک عرب کے ریگستان اور کوہستان سے تجاوز نہ کر سکا، اور قدیم شاعری اُسی تنگ دائرہ میں سمٹی رہی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان شعرا کی نگاہیں دوسرے ملکوں کی چیزوں سے ناآشنا تھیں۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ عربی کی قدیم شاعری میں نازک خیالی کم ہے اور مناظر

بہت. لیکن جو نازک ہے، وہ بہت ہی لطیف اور دل فریب ہے۔ میں امرؤالقیس کے قصیدے کا ایک شعر لکھتا ہوں، جس کی نازک خیالی اور فصاحت نے مجھے ایسا لطف دیا ہے کہ جب میں اِس کو پڑھتا ہوں، تب مجھ پر وجد کی حالت طاری ہوتی ہے۔ یہ قصیدہ سبعہ معلقہ کا ہے اور اس میں افصح البیان شاعر نے اپنی معشوقہ کی حالتوں کا نقشہ سلسلے کے ساتھ کھینچا ہے۔ مناظر کا تسلسل ربط کے ساتھ خود اس لاجواب قصیدے کا ایک لطف ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

خَرَجْتُ بِهَا أَمْشِي تَجُرُّ وَرَاءَنَا ‖ عَلَى أَثَرَيْنَا ذَيْلَ مِرْطٍ مُرَحَّلِ

معنے یہ ہیں کہ "میں اُس (معشوقہ) کو باہر لایا اور وہ ہم دونوں کے (یعنی اپنے اور میرے) نقشِ پا پر اپنی ردائے منقش کے دامن کو کھینچتی ہوئی چلتی تھی۔" لطیف گوشہ ہے خیال کی نزاکت اور بیان کی نفاست کے ساتھ یہ بات دکھائی ہے کہ معشوقہ کس والہانہ انداز سے پاؤں کے نشانات کو مٹا مٹا کے راز کو چھپا رہی تھی۔

عربی کی قدیم شاعری نے آخر پلٹا کھایا اور [illegible] کی سرزمین پر متنبی ایسے بلند پرواز شعرا پیدا ہوئے، جنکی نگاہیں مناظر سے گزر کے نازک خیالیوں کے ساتھ استعارات اور تشبیہات کی صورتوں کو عرش سے گنجینے کے صفحوں کے میدانوں میں لانے لگیں۔ جن کی تخیل کی نزاکت اور مضامین کی بلندی تو قبضے میں آ گئی، لیکن فطرتی مناظر کی قلمرو ہاتھوں سے نکل گئی اور خیالات عقلی نے نظموں میں جگہ حاصل کر لی۔ دیکھو! متنبی کہتا ہے ؎

فَأَيُّمَا قَدَمٍ سَعَيْتُ إِلَى الْعُلَى ‖ أَدَمُ الْهِلَالِ لِأَخْمَصَيْكَ حِذَاءُ

معنی یہ ہیں کہ "اے (ممدوح) تو کن بانوؤں سے بلندی پر رسا ہوا کہ ہلال کی جلد بدن تیرے قدموں کی پاپوش ہو گئی ہے۔" اب دونوں اشعار کا موازنہ کر کے مذاقِ سخن کے تغیر کو دیکھو متبنّی کا ممدوح ہارون تھا۔ اس وقت کے علمی جوش اور تعلّی پسند طبائع نے شاعری کی طبیعت کو اپنے رنگ پر کھینچ لیا، اور استعارات دور از واقعہ عقل کے دائرے سے متجاوز ہوتے فہم کو چکّر میں ڈالنے لگے۔

میں نے تسلیم کیا ہے کہ عربی کی قدیم شاعری میں سلسلہ بیان موجود ہے۔ بے شک ہے، مگر ہندوستان کی سی دلفریب ادائیں عرب میں کہاں۔ ان اداؤں کے تسلسل نے جو لطافتیں عالم خیال کی نظموں میں پیدا کی ہیں، اور جیسے فطرت کے نقشے ان میں کھنچے ہوئے ہیں، ان کی نازک خیالیاں ایسے جذبات انسانی کے ساتھ کہیں اور نہیں ملیں۔ امرء القیس کی مسلسل نظم سب دیکھ جائیے۔ چوٹی کا شعر بس ایک ہی ہے جیسے میں نے لکھا ہے، اور اشعار مناظر کے ہیں؛ مگر وہی ملک عرب کے مناظر۔ فصاحت کا پایہ سبعہ معلقہ سے خود اپنی بلندی کی شان دکھا رہا ہے۔ نظم ایسی لاجواب کہ خانۂ کعبہ پر جواب کی طلب میں آویزاں کی گئی اور کسی سے جواب نہ ہو سکا۔ لیکن ہم لوگوں کا مذاق کچھ ہندوستان کی دلفریبیوں اور کچھ انگریزی علم ادب کے پھیلنے سے فطرت کے جذباتِ انسانی کو ڈھونڈھتا ہے۔ یہ خوبیاں اگر نظر آئیں تو قوتِ بیان، لطافتِ زبان اور قدرتِ کلام کے ساتھ عالمِ خیال کی دلکش نظموں کے سلسلے میں نظر آئیں۔

فارسی کی شاعری جس نے اردو کی شاعری کو پیدا کر کے گود میں پالا، اس کی

نسبت میں لکھوں تو کیا لکھوں۔ اُس میں عورت اور مرد کے فطری جذبات اور قلبی محسوسات کا پتا نہیں۔ کم کم ایسے خیالات جو واقعاتِ ذہنی اور واردات فہمی سے متعلق ہوں، غزلوں کے متفرق اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی بیشتر امرد پرستی کے ساتھ۔ امرد پرستی ایک ایسی شرم ناک حالت ہے، جس کے خیال سے غیرتِ انسانی اور حمیت فطری، یہ دونوں بے حیائی کے نظارے سے حیا کے پسینے میں ڈوبی جاتی ہیں۔ اُردو شاعری کی سرزمین پر بھی یہ بلا فارسی شاعری سے نازل ہوئی، اور اس نے دامانِ سخن کو گندے پانی سے آلودہ کر دیا۔ کاش! ہندوستان کی خاکِ غیرت ناک پر جنم لے کے اُردو شاعری نے یہیں کی با جذبات اور پُر تاثیر شاعری کا رنگ پکڑا ہوتا۔ یہ کایا پلٹ اب بھی ممکن ہے، بشرطیکہ ہمارے معزز سخن سنج اپنے خیالات کی کروٹیں بدل دیں۔

اب میں ان بحثوں کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ ریویو پر جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکا۔ البتہ مختصر الفاظ کے ساتھ اصل نظموں پر دماغ اور قلم کو ضرور متوجہ کروں گا، تاکہ وہ جذباتِ قلبی اور واقعاتِ حقیقی جن کے سلسلہ بیان میں حضرت لسان الملک نے لطیف الفاظ کے بے بہا موتی پروئے ہیں، ان موتیوں کی چمک سخن کے جوہریوں کو دکھا دوں۔

پہلے رُخ کا شعر ؎

ساون اور یہ گھٹا۔ میں کہیں ہوں وہ کہیں
حسن یہ انھیں کا ہے اور وہ دیکھتے نہیں

ہندوستاں کی برسات، اور اُس میں خاص طور پر ساون کے مہینے کو یہاں کی عورتوں کے قلبی احساسات اور فطری جذبات سے خاص تعلق ہے۔ اس شعر میں یہ ٹکڑا "حسن یہ اُنہیں کا ہے" دل کو کھینچ لیتا ہے۔ عورت نے کس خوبصورتی سے اپنے حسن کا ذکر کر کے پاکبازی کو ثابت کیا ہے "اُنھیں" کے لفظ سے انحصار، کس قدر لطیف اور پر اثر بلاغت ہے ؂

کس سے ناز اب کروں میرے ناز اُٹھائے کون	روٹھنے کو روٹھ لوں لیکن اب منائے کون
کس سے اپنے دل کا بھید اب میں کھلکے کہہ سکوں	کسکے ساتھ بے جھجک اب میں ملکے رہ سکوں

پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں "اب منائے کون" دوسرے شعر میں "دل کے بھید کا کھل کے کہنا اور بے جھجک مل کے رہنا" یہ فصیح الفاظ بلیغ اشارات سے طرز معاشرت کی لطافتوں کو کیسے کیسے دلاویز کنایوں سے ظاہر کر رہے ہیں۔

دوسرے رخ کا شعر ؂

خط سے پڑھی جگر پہ چوٹ زخم ہرے ہوے ہیں آج
تم سے ہزار ہا گلے دل میں بھرے ہوے ہیں آج

دوسرے مصرع کی لطافت قلم کی زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ دل اگر زبان بن کے منھ میں آ سکے تو وہ بھی تشریح کر کے تھک جائے، اور شرح پوری نہ ہو۔ اللہ ری بلاغت! اور پھر سہل ممتنع بیان کے ساتھ!! ؂

تم نہ ستم کرو تو کیوں دل مرا بے قرار ہو	میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گناہگار رہو

کیا میں خدا کے سامنے تم کو سزا دلاؤں گی — اپنی وفا کے نام کو خاک میں کیوں ملاؤں گی

پہلے شعر کا دوسرا مصرع کس تیور کا ہے، اور کیسے دل کش پیرائے میں حسن بیان کا مزہ دے رہا ہے۔ دوسرا شعر پہلے شعر کی شرح کر رہا ہے اور "وفا" جو اخلاق انسانی کا جوہر لطیف ہے، اس کو کس خوبی سے دکھا رہا ہے۔

تصویر کے متعلق چند اشعار کے بعد کیا لطیف نتیجہ ذیل کے فصیح شعر سے نکالا گیا ہے، جو خیالات فطرتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے ؎

تم نظر آہی جاتے ہو۔ اے وہ خیال ہی سہی
کچھ نہیں تو شبیہ سے صرف جمال ہی سہی

"وا" اور "کچھ نہیں"، ان الفاظ کے مطالب زبان کی فصاحت، بیان کی لطافت، اور مفہومات معنوی کی بلاغت کے ساتھ جو کچھ دل سے کہہ رہے ہیں، دل ہی جانتا ہے ؎

آؤ جو تم تو رخ پہ میں آنچل اٹھا کے ڈال لوں
اس میں تو حرج کچھ نہیں جھانک کے دیکھ بھال لوں

گھر کی عورتوں کے ہوتے شوہر اور زوجہ کے معاشرانہ برتاؤ کی ادا یہی ہے، لیکن اظہار رنجش کے ساتھ کس طنز کے پیرائے میں ظاہر کی گئی ہے کہ دل ہی اس لطف کو جانتا ہے۔ شوہر کے قلب پر یہ طنز کیا اثر ڈال سکتی ہے۔ اس کا اندازہ مشکل ہے۔

تیسرے رُخ میں جو قوت شاعری ہے، اسکی داد میں کہاں تک دوں۔ دوسرے جہان کی تلاش جہاں کچھ غم ہی نہ ہو اور دونوں بے کھٹکے رہ سکیں۔ قیامت کا جوش

جذبات روحی میں پیدا کر رہا ہے۔ زبان ہے کہ نظم میں نثر کا لطف دے رہی ہے۔ ادائیں ہیں کہ کلیجے میں چٹکیاں لے رہی ہیں۔ واقعات ہیں کہ جو ہو بہو تصویر کو آنکھوں کے سامنے لا رہے ہیں۔ اللہ ری تخیل کی رسائی! فطری اداؤں کو عرش معلےٰ پر پہنچی ہیں بیچنے دیتی! کھینچ لاتی ہے۔ سب نظم لاجواب ہے مگر میں صرف ایک شعر لکھے دیتا ہوں ؎

قسم ہے بے رُخی کی جبیں کو چھپا کے رُخ عیاں کرے
قسم ہے خامشی کی جب نگاہ کچھ بیاں کرے

یہ شاعری کیا ہے سحر کاری ہے۔ نگاہ کا بیان کرنا وہ مزہ دے رہا ہے کہ دل سیر ہوتا ہی نہیں۔ پوری نظم اسی رنگ کی ہے۔

چوتھا رخ اس قدر اداؤں سے بھرا ہوا ہے کہ اگر اس پر میں پورا پورا ریویو لکھوں تو تمام نظم لکھنی پڑے۔ اور ایک ایک شعر صفحے کے صفحے لے لے۔ عورت شوہر کی آمد آمد کے خیال سے کیا کہتی ہے ؎

کل مرے سر میں تھا جنوں آج ہے کچھ غرور سا
کل مرے دل میں تھا ملال آج ہے کچھ سرور سا

کیا غرور ہے اور کیا سرور! پوری نظم موتیوں سے بھی زیادہ گراں بہا ہے۔ کہاں تک میں تعریف کروں اور کس کس شعر کی داد دوں۔ سلاست کی شہادت خود نظمیں دے رہی ہیں۔ اس لیے کہ چاروں رخوں میں اضافت کا وجود نہیں۔ سیدھی سادی اردو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی زبان میں اضافت تسلیم نہیں کی گئی، اور یہ

نظمیں یا عورت کی جانب سے ہیں یا عورت کی جانب۔

ریویو طویل ہوگیا۔ اب میں اسے ختم کرتا ہوں، اور دعا دیتا ہوں کہ خدا حضرت شوق قدوائی کی عمر میں برکت دے، جن کے دماغ نے اُردو کے خزانے میں انمول جواہر بھر دیے ہیں۔

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

پہلا رُخ

ایک عورت کا شوہر پردیس میں ہے، وہ اُسکی یاد
میں محو اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے:-

آج اے مرے خیال تو، کہاں کہاں گیا — دل بھی تیرے ساتھ تھا تو جہاں جہاں گیا
تو نے رُخ جدھر کیا، دل کا رُخ اُدھر پھرا — تو پھرا جو پاس سے، دل بھر آیا، سر پھرا
جب سے وہ جدا ہوئے تب سے اُنکا دھیان ہے — اُن سے مجھکو اُنس ہے، اُن میں میری جان ہے
جا کے پھر مری خبر کیوں نہ لی ستم کیا — میری یاد میری چاہ، کیوں نہ کی ستم کیا
مجھ سے کیوں خفا ہیں وہ، پھر گئی نظر تو کیوں — دل نہیں ادھر تو کیوں، رُخ نہیں ادھر تو کیوں
میرے رُخ سے دور ہے، وہ نگاہ اب کہاں — اُن کا پیار اب کہاں، اُنکی چاہ اب کہاں
میں وہی ہوں یا نہیں، وہ وہی ہیں یا نہیں — اُنکے دل کی حالتیں وہ رہی ہیں یا نہیں
ساون اور یہ گھٹا، میں کہیں ہوں وہ کہیں — حسن یہ اُنھیں کا ہے، اور وہ دیکھتے نہیں

ساتھ والیوں کے ساتھ، جھولنے کو جاؤں کیا　　دل وہاں ہے وہ جہاں، سہیلی سے گاؤں کیا

پینگ آئین جائیں گے، اور رہے گا دل مرا　　مل کے کیا میں گاؤں گی؟ کیا لے گا دل مرا

کھل پڑے گی خود بخود، چاہ ہر صدا کے ساتھ　　منہ سے باہر آئے گی، آہ ہر صدا کے ساتھ

کرتی ہیں جگر کا خون، ہمسنیں جو ساتھ ہیں　　وہ لگا رہی ہیں آگ، جن کے لال ہاتھ ہیں

اور بھی لگائی آگ، ساونی نے بھول کر　　پیڑ پر مری نظر، پھر پڑے نہ بھول کر

یہ شباب کی امنگ، اب کسے دکھاؤں میں　　رخ کا لال لال رنگ، اب کسے دکھاؤں میں

لال یہ کہاں رہا، زرد ہو کے رہ گیا　　رنگ اب کہاں ہے رنگ، گرد ہو کے رہ گیا

جسم وہ نہیں رہا، اس میں کس نہیں ہے اب　　ہونٹھ وہ نہیں رہے، ان میں رس نہیں ہے اب

جونک بن کے رات دن چوستا ہے غم لہو　　زرد ہو گیا بدن، رہ گیا ہے کم لہو

کاجل اور مسی کا لطف جب نہیں وہی تو کیا　　آئینہ میں خود ہی میں، دیکھتی رہی تو کیا

آرسی کو پھینک دوں، منہ لگا کے کیا کروں　　بن سنور کے کیا کروں، پان کھا کے کیا کروں

زیور اب پہن چکی، جی سے اب اتر چکا　　جائے بھاڑ میں سنگار، دل اب اس سے بھر چکا

کس سے ناز اب کروں میرے ناز اٹھائی کون　　روٹھنے کو روٹھ لوں، لیکن اب منائے کون

کس سے اپنے دل کا بھید اب میں کھل کے کہہ سکوں　　کس کے ساتھ بے جھجک اب میں مل کے رہ سکوں

مانگتی جو کوئی چیز، ان سے مسکرا کے میں　　ہنستے اسکو دیکھتے وہ، ہنستی اسکو پا کے میں

دل میں اب لگی ہے آگ، دل لگی وہ لے گئے　　اب ہنسی کا منہ کہاں، سب ہنسی وہ لے گئے

یا تو مجھ سے چھین لے، انکی یاد اے خدا　　یا تو ان کو لا کے کر مجھکو شاد اے خدا!

یا تو کر حسرتِ مجھے، ہوش میں نہ آوں میں
یا تو اپنے ہوش میں، اُن کو دکھ پاوں میں

کام کچھ نہ کر سکا، اُو خیال جا کے تو
مجھسے کچھ نہ کہہ سکا، اُن کا حال آ کے تو

تو نے میرے دل کا درد، اُن سے کچھ کہا بھی تھا
اُن سے مل کے تجھکو یاد میرا غم رہا بھی تھا

کیا میں تجھسے پوچھ اُٹھی، تو پیامبر نہیں
تجھ میں گو رسائی ہے، گفتگو مگر نہیں

گفتگو نہ ہو تو خیر دل پہ تیرا بس تو ہے
دل کی دلکو دے خبر، ہاں یہ دسترس تو ہے

پھر کے "اُن" کے دل کے گرد، گھیرنا ضرور تھا
اُنکے دل کو میری سمت، پھیرنا ضرور تھا

اُنکے دل میں کر کے راہ، کیوں نہ اُنمیں کی جگہ
تُو تو تھا مرا خیال، کیوں نہ لی مری جگہ

اُنکے دل میں میری جا، شاید اب نہیں رہی
چھن گئی مری جگہ، اور میں نہیں رہی

شاید اور کوئی شکل، کھب گئی نگاہ میں
کوئی روک ہو گئی، اس طرف کی راہ میں

توبہ! ہو کے بدگمان، میں نے کی خطا ضرور
چاہیں وہ کہیں رہیں، اُن میں ہے وفا ضرور

کاش او خیال تو، اب نہ آئے میرے پاس
کاش اُنکی یاد تو، اب نہ لائے میرے پاس

یا مری نظر کو لے، اور اُن کے پاس جا
مجھسے تو جگر کو لے اور اُن کے پاس جا

دیکھ لے نظر اُنھیں، دیکھ لیں جگر کو وہ
آئے مجھپہ کچھ ترس، آئیں اپنے گھر کو وہ

گھر کا نام خاک لوں، بن کے یہ بگڑ چکا
اس پہ اوس پڑ چکی، مٹ چکا اُجڑ چکا

چھت ٹپکتی ہے، تو اُنہہ، کون اُسکی لے خبر
رو رہی ہوں میں ادھر، رو رہی ہے وہ اُدھر

رنگ خاک میں ملا، خاک رنگ پر چڑھی
رنگ اُسی قدر گھٹا، خاک جسقدر بڑھی

میں ہی خاک میں ملی، گھر کی فکر خاک ہو
"اُن" کا ذکر چھوڑ کر گھر کا ذکر خاک ہو

وہ پلنگ انھیں کا ہے، اسباب رہے تو کون — خود ہی آ کے وہ رہیں، جا کے یہ کہے تو کون

اڑ گیا ہے خاک میں، گرد ہو گیا پلنگ — آئیں وہ تو مجھ سے لیں، اور اک نیا پلنگ

ذکر کیا پلنگ کا، یہ ذرا سی چیز ہے — مجھکو اپنی جان تک اُن سے کب عزیز ہے

راہ اُن کی روک لوں، اب جو اُنکو پاؤں میں — پتلیوں میں دوں جگہ، سامنے بٹھاؤں میں

بال اپنے کھول کر، اُن پہ جال ڈال دوں — جب ذرا قدم ہلیں، اُن پہ بال ڈال دوں

ائیں! یہ بولتا ہے کون، درد جسکے دل میں ہے — گرم آتی ہے ہوا، آگ اسکے دل میں ہے

کوئی آکے پیڑ پر، کہہ رہا ہے "پی کہاں" — پی کہیں ہیں، میں کہیں، کیا کہوں ہے جی کہاں

جی رہی ہوں میں، مگر جی مرا ہے پی کے ساتھ — پاس ہوں کہ دور ہوں، ہیں وہ میرے جی کے ساتھ

آئی اُن کی سمت سے، اور بو بھی لائی تو — آج ادھر ہوا ضرور، اُن کو چھو کے آئی تو

اُن سے ملکے آئی ہے، آ تری بلائیں لوں — تو نے خوش کیا مجھے، لے تجھے دعائیں دوں

جا کے اُن کے پاس پھر، تو جو اُن کو لا سکے — درد دل کا جا سکے، چین دل کو آ سکے

او دل اور کیا کروں، تیرے درد کا علاج — خط میں رکھ کے بھیج دوں، تجھکو اُنکے پاس آج

شرط ہے کہ میرے پاس، پھر پلٹ کے آئے تو — اپنے خون کی قسم، دیکھ اُن کو لائے تو

یوں نہ آئیں تو میں لوں شوق کی کشش سے کام
کھنچکے آئیں اس طرح، تو نہ لیں اُدھر کا نام

پہلے رخ پر ایک نظر

تصویر سے "عالم خیال" کا دکھانا جس قدر مشکل ہے اُس سے بدرجہا دشوار الفاظ میں "عالم خیال" کی نقاشی کرنا ہے۔ ایسی مرقع نگاری نہایت عالی پایہ کا نغار یا شاعر چاہتی ہے۔ نہ صرف اُردو بلکہ یورپ کی زبانیں بھی اس مضمون میں ایسی بے نظیر اور مسلسل نظم سے خالی ہیں جیسی کہ عالم خیال کی نظم ہے۔ بھاشا میں اگر ہوں تو مجھے خبر نہیں، لیکن اُردو زبان میں ایسی نظم اس سے پہلے نہ تھی۔

شاعری کے لیے اُردو زبان بعد "شاعروں کی زبان" یعنے فارسی کے مرتبہ رکھتی ہے۔ الفاظ میں، محاورات میں، بندش میں، وہ ایک شاعر کے لیے محبوب زبان ہے۔ اُس کے شعرا نے فطرت کے مناظر یا انسانی جذبات دکھانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تو یہ اس کا قصور نہیں، بلکہ اس کے شعرا کا اور اُن سے بھی زیادہ اُس سوسائٹی کا ہے جس میں اُردو زبان پھولی پھلی۔

یہ اعتراض اُردو زبان پر نہیں ہو سکتا کہ اُس کا ادب خیالات نفیس اور جذبات فطری سے مالامال نہیں۔ اُردو شاعر بھی بہت کچھ اس الزام سے اس لیے بری ہیں کہ باوجود سوسائٹی کے دوسرے رنگ پر ہونے کے انھوں نے فطری مناظر و طبعی جذبات دکھائے ہیں۔ میر کی شاعری اوّل اوّل، میر انیس کے مرثیے اور قلق کی مثنوی "آخر دور" میں

ایسے مناظر و جذبات سے مملو ہیں۔ میری رائے ہیں خیالات کی بلندی میں دنیا کا کوئی شاعر خواہ وہ یورپ کا ہو یا ایشیا کا اسد اللہ خان غالب سے اونچا نہیں جا سکا، یا کوئی شاعر، سوا نادر ابو جود حافظ شیرازی کے، لطیف خیالات کو زبان سے آتش سے زیادہ خوبی سے ہم آہنگ نہیں کر سکا۔

زمانہ کے رنگ کے ساتھ اُردو شاعری نے بھی طرز بدلا تو گو اُس نے نئے طرز کے نہایت رکیک "ملک الشعرا" اوّل اوّل پیدا کئے، مگر تھوڑے ہی دنوں میں جناب شوق کے سے اُستاد بھی نکالے۔ کچھ شبہ نہیں کہ ہندوستان کے کل زندہ شعراء میں اُستادی کا مرتبہ اگر کسی کو حاصل ہے تو اُسی قادر الکلام شاعر کو جسکی بے نظیر نظم "حسن" دُنیائے شاعری کو محو کر چکی تھی، یا اب اس چھوٹی سی نظم عالم خیال نے نقادوں کے دلوں میں ولولہ ڈال دیا۔

نظم و نثر اردو کے موجودہ دو نقاد یعنی ایک منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ اور دوسرے منشی جوالا پرشاد صاحب برق جو "تصویر یار" کی سی خوش ادا و دلنشیں نظم کے مصنف ہیں حضرت شوق کے مدح سرا ہیں، اور اُن کے سرٹیفکٹوں کے بعد میرے خیال میں کسی دوسرے کے سرٹیفکٹ کی محتاجی نہیں ہو سکتی۔

فطرت انسانی سے باخبر شاعر نے عالم خیال کی نظم کی بحر بھی نہایت موزوں مناسب مضمون رکھی ہے۔ ایک عورت کے خیالات جس عمدگی سے، جیسے سادہ الفاظ میں اس بحر میں ادا ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ پر خود ہی شاعر کی اُستادی کے ثبوت ہیں۔ ہر نکتہ چین کا فرض ہے کہ وہ کسی نظم یا نثر پر نکتہ چینی کرتے وقت مضمون اور موقع کا بھی خیال رکھے، ورنہ

اس کا اعتراض خود اسی کو قابلِ مضحکہ بنا دے گا۔ مثالاً عالم خیال کا یہ تیسرا شعر لیجئے ؎

جب سے وہ جدا ہوئے تب سے اُسکا دھیان ہے
اُن سے مجھکو انس ہے اُن میں میری جان ہے

کسی مرد کے مُنھ سے یہی پاکیزہ شعر دو کوڑی کا ہو جائے گا۔ جب، تب، وہ، دھیان، جان،
یہ سب اُسی وقت تک اس شعر کی کشش کا باعث ہیں جب تک کہ وہ ایک عورت کے
مُنھ سے نکلے سمجھے جائیں۔

دوسرا مصرع پورا ہی بے موقع ہو جائے اگر ایک عورت کی طرف سے نہ کہا گیا ہو۔
اول شعر کو اس کے بعد کے شعر ؎

جا کے پھر مری خبر کیوں نہ لی ستم کیا
میری یاد میری چاہ کیوں نہ کی ستم کیا

کے ساتھ پڑھو اور تب اول شعر کا دوسرا مصرع نہ صرف ایک خاص مزہ دے گا
بلکہ عورتوں کی ایک فطری عادت کو ظاہر کرے گا۔

عورتیں کسی شکایت کے وقت اپنی جانب سے محبت کا اظہار ضرور کر دیتی ہیں،
"ائے قربان جاؤں، کیا مجھے بھول ہی گئے"! یہی طرز ادا، یہی خیال ہے جو ان دو
شعروں میں خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے۔

ابتدائی دو شعروں سے ؎

آج او مرے خیال تو کہاں کہاں گیا   دل بھی ترے ساتھ تھا تو جہاں جہاں گیا

تو نے رُخ جدھر کیا دل کا رُخ اُدھر پھرا تو پھرا جو پاس سے دل بھر آیا سر پھرا

کے بعد تیسرا شعر لاناشاعر کی کمال اُستادی ظاہر کرتا ہے۔ ابتدائی دو شعروں سے یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ عورت کو اپنے شوہر کا خیال صرف "آج" آیا تیسرے شعر نے اس خیال کو رفع کر دیا۔ گو وہ عورت اپنے خیال کی تنقیح کرنے "آج" بیٹھی ہے مگر جب سے وہ جدا ہوئے تب سے اُن کا دھیان ہے۔

شروع سے پانچواں اور ساتواں شعر پھر آلودہ محبت، زود حس، زود اثر عورت کے خاص خیالات ہیں جو اپنی منطق آپ ہی رکھتے ہیں، اور جنکا طریقہ استدلال بھی ان کا اپنا ہوتا ہے، شوہر بے چارہ جس مجبوری سے گھر نہ آسکا ہو مگر شوہر کی محبت میں مجنوں عورت یہی کہے گی ؎

مجھسے کیوں خفا ہیں وہ پھر گئی نظر تو کیوں دل نہیں ادھر تو کیوں رُخ نہیں ادھر تو کیوں

مین وہی ہوں یا نہیں وہ وہی ہیں یا نہیں اُنکے دل کی حالتیں وہ رہی ہیں یا نہیں

اشعار ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ایک فراق زدہ عورت کے دلی خیالات کو ایسی خوش اسلوبی سے ظاہر کرتے ہیں کہ دل پھڑک اُٹھتا ہے ؎

ساتھ والیوں کے ساتھ جھولنے کو جاؤں کیا دل وہاں پر وہ جہاں بیدلی سے گاؤں کیا

پینگ آئیں جائیں گے اور رہے گا دل مرا ملکے کیا مین گاؤں گی کیا ملے گا دل مرا

غضب کے درد آگیں یہ دو شعر اُن میں سے ہیں ؎

کھل پڑے گی خود بخود چاہ ہر صدا کے ساتھ منہ سے باہر آئے گی آہ ہر صدا کے ساتھ

کرتی ہیں جگر کا خون ہمسنیں جو ساتھ ہیں وہ لگا رہی ہیں آگ جن کے لال ہاتھ ہیں

ہمسنوں میں سے بعض کے مہندی لگے ہاتھ اور ساونی کے پھول دیکھکر عورت کو اپنی نوجوانی اور اپنی خوبصورتی کا اس طرح خیال آتا ہے، مگر وہ بھی اپنے شوہر کی یاد کے ساتھ ؂

یہ شباب کی اُمنگ اب کسے دکھاؤں میں

رُخ کا لال لال رنگ اب کسے دکھاؤں میں

کچھ شبہ نہیں ہے کہ نقاش نے محو خیال کی جو تصویر کھینچی ہوگی اس میں عورت کو نوجوان اور حسین دکھایا ہوگا۔ شاعر وہی کام جو الفاظ سے لینا چاہتا ہے اس کو عورت کی نوجوانی اور حسن کا دکھانا زیادہ دشوار تھا مگر باکمال اُستاد نے کس خوبصورتی سے نقاشی کی ہے یہ شعر اس موقع کی جان ہے۔

ایک حسین نوجوان عورت ہے، وہ اپنے ہمسنوں کے بناؤ سنگار دیکھتی ہے، ساون کی گھٹاؤں میں ساونی کا رنگ، اُسکے جوش شباب کو اُبھارتا ہے، فطرتاً اُسے اپنے حسن پر ناز سا ہوتا ہے، اپنے گلرنگ رخساروں کا، اپنے شباب کی امنگ کا خیال آتا ہے، مگر یہ ہماری ایشیائی عورت جس کا حسن، بناؤ سنگار، شباب، جو کچھ ہے اپنے شوہر اور صرف اپنے شوہر ہی کے لیے ہے، اور یہ شوہر کوسوں کے فاصلہ پر ہے تو گو اُس حسن اور شباب کا فطری خیال تو نہیں رُکتا مگر اس کے ساتھ یہ پریاس خیال بھی آہی جاتا ہے "اب کسے دکھاؤں میں" دوسری حسین چیزوں کے دیکھنے یا دوسرے کے حنائی ہاتھوں کے نظارے سے اپنے پرنمکین حسن کا خیال عورت کو آیا مگر پھر فراق شوہر میں بدلی ہوئی

صورت بھی اس طرح یاد آئی ہے

لال یہ کہاں رہا زرد ہو کے رہ گیا　　رنگ اب کہاں ہے رنگ گرد ہو کے رہ گیا
جسم وہ نہیں رہا اس میں کس نہیں ہے اب　　ہونٹھ وہ نہیں رہے ان میں رس نہیں ہے اب
جونک بن کے رات دن چوستا ہے غم لہو　　زرد ہو گیا بدن، رہ گیا ہے کم لہو

ان اشعار کے ذریعہ سے شاعر نے یہ بات بھی دکھادی کہ عورت خوش رنگ تھی، رعنا جسم بھی رکھتی تھی، باریک رسیلے ہونٹھ تھے، تندرست و توانا تھی، فطرت کا یہ مقتضا بھی ظاہر کیا کہ دوسروں کے مقابلے اپنے کمال کا خیال ضرور آتا ہے، اور اس عورت کی حالت فراق سے عام ہمدردی کو بھی دوچند کر دیا، اس لیے کہ یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ عورت کو نہ صرف اپنے شوہر سے جدائی ہی کا درد ہے بلکہ اُس کو اپنے حسن کے گھٹ جانے کا بھی احساس ہے۔

اب اس کا اندازہ ہر ذی دل کر سکتا ہے کہ فراق شوہر میں ایشیائی عورت کے قلب کی کیا حالت ہوتی ہو گی۔

بناؤ سنگار جو قدرتی حُسن کے بعد کی چیزیں ہیں اس میں اسے کیا دلچسپی رہے گی زیور جو شباب اور حُسن کی زینت کی چیز ہے اس کی کیا پروا رہے گی، شاعر ان خیالات کو اس طرح ظاہر کرتا ہے

کاجل اور مسی کا لطف جب نہیں وہی تو کیا　　آئینے میں خود ہی میں دیکھتی رہی تو کیا
آرسی کو پھینک دوں منھ لگا کے کیا کروں　　بن سنور کے کیا کروں پان کھا کے کیا کروں

زیور اب پہن چکی، جی سے یہ اُتر چکا جائے بھاڑ میں سنگار دل اب اس سے بھر چکا

ان اشعار میں علاوہ الفاظ اور بندش کی خوبیوں کے اول شعر کا دوسرا مصرع انتہائے حجاب و پارسائی بھی دکھاتا ہے۔ وہ مصرع صاف ظاہر کرتا ہے کہ عورت کے کاجل اور مسی کو سوا اس کے شوہر کے اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا، اور اب جب شوہر دور ہے تو سوا اس کے کہ عورت خود انھیں آئینہ میں دیکھے اور کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا، لیکن وہ اس قدر خود پسند نہیں ہے کہ خود اپنے دیکھنے کے لیے کاجل اور مسی لگائے۔

جو لوگ فطرت انسانی سے واقف ہیں وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ عورت پر کہاں تک شوہر کی جدائی کا صدمہ ہوگا جب وہ زیور سی محبوب نسواں چیز سے بیزار ہو بیٹھی اور خود آرائی کے سے دلفریب نسوانی مشغلہ سے سیر ہو گئی۔

زیور اور بناؤ سنگار سے نفرت تو تھی ہی، اُس کے دل کو یہ خیال آکر اور نشتر لگاتا ہے کہ اب اس کا کوئی ناز بردار نہیں، کوئی رازدار نہیں، کوئی ایسا بھی نہیں جس سے وہ کھلکر کوئی چیز مانگ سکے، شاعر نے کس مزے سے یہ خیالات ادا کیے ہیں ؎

کس سے ناز اب کروں میرے ناز اُٹھائے کون روٹھنے کو روٹھ لوں لیکن اُسے منائے کون
کس سے اپنے دل کا بھید اب میں کھلکے کہہ سکوں کس کے ساتھ بے جھجک اب میں ملکے رہ سکوں
مانگتی جو کوئی چیز اُن سے مسکراکے میں ہنستے اُسکو دیکے وہ ہنستی اُسکو پاکے میں

آخر کا شعر زن و شوہر کے بے انداز محبت کے معاملہ کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں دو لفظیں "اُن" اور "وہ" ایک مخصوص حلاوت پیدا کرتی ہیں۔ انتہائی یاس اور درد کے یہ دو شعر ہیں ؎

یا تو مجھ سے چھین لے اُن کی یاد اے خدا — یا تو اُن کو لا کے کر مجھ کو شاد اے خدا
یا تو کر شرن مجھے ہوش میں نہ آؤں میں — یا تو اپنے ہوش میں اُن کو دیکھ پاؤں میں

اس حد تک آ کر عورت کی طبیعت اپنے خیال سے بھی اس طرح برافروختہ ہوتی ہے ؎

کام کچھ نہ کر سکا، او خیال جا کے تو — مجھ سے کچھ نہ کہہ سکا اُنکا حال آ کے تو
تو نے میرے دل کا درد اُن سے کچھ کہا بھی تھا — ان سے ملکے تجھکو یاد میرا غم رہا بھی تھا

آخر کا شعر عورت کی ایک خاص کیفیت ظاہر کرتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ جس طرح وہ اپنے شوہر سے ملکر دنیا کو فراموش کر بیٹھی، اسی طرح مبادا اس کا خیال بھی اس کے شوہر تک پہنچکر (شوہر کے پاس تک پہنچنے کی خوشی میں) اُس فرقت زدہ عورت کا غم بھول جائے۔

عورت اپنے جذبہ سے کام لینا چاہتی ہے اور کہتی ہے ؎

گفتگو نہ ہو تو خیر، دل پہ تیرا بس تو ہے — دل کو دل کی دے خبر، ہاں یہ دسترس تو ہے
پھر کے اُن کے دل کے گرد گھیرنا ضرور تھا — اُنکے دل کو میری سمت، پھیرنا ضرور تھا
ان کے دل میں کر کے راہ کیوں نہ آ ئیں میری جگہ — تُو تو تھا مرا خیال، کیوں نہ لی مری جگہ

ان اشعار کے بعد ایک ایشیائی عورت کے اشد یاس کے خیالات اس طرح ادا ہوئے ہیں ؎

ان کے دل میں میری جا شاید اب نہیں رہی — چھن گئی مری جگہ، اور میں کہیں نہیں رہی
شاید اور کوئی شکل کھب گئی نگاہ میں — کوئی روک ہو گئی اس طرف کی راہ میں

ان اشعار میں لطافت زبان کے علاوہ ایک ایشیائی عورت کے شوہر سے ملنے کی

یاس جو پُرحسرت خیال کی انتہا ہے وہ ظاہر ہوتی ہے۔

ایشیا کی عورت بہت مشکل سے اپنے شوہر سے بدگمان ہوتی ہے۔ دیوتا یا مالک جو کچھ ہوتا ہے اس کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ وہ لاکھ برائیاں رکھتا ہو مگر ایک محبتی عورت کے نزدیک وہ تمام عیوب سے پاک رہے گا، جس طرح وہ اپنے نفس سے مطمئن ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کی طرف تشویش و ترغیب کبھی نہ ہو (اس تشویق و ترغیب کے موقع ایسے اسقدر نہیں ملتے جسقدر یورپ کی عورتوں کو ملتے ہیں) نیت بد کبھی بھولے سے نہ ہوگی، ویسا ہی وہ اپنے شوہر کے متعلق بھی قیاس کرتی ہے، لیکن شوہر کی مفارقت کا سودا اس حد تک تھا کہ آخر بدگمانی کا خیال آئے بغیر نہ رک سکا، مگر عارضی، فوراً ہی یہ خیال آگیا ؎

توبہ ہو کے بدگمان میں نے کی خطا ضرور

چاہیں وہ کہیں رہیں ان میں ہے وفا ضرور

اور اس پر وہ خیال میں بھی شوہر کی وفا پر شبہ کرنے سے اس طرح بیزار ہوئی ؎

کاش اُو خیال تو اب نہ آئے میرے پاس

کاش اُنکی یاد تو اب نہ لائے میرے پاس

آخر کا مصرعہ یہ فطری جذبہ ظاہر کرتا ہے کہ محبوب سی محبوب چیز بھی شاق ہو جاتی ہے اگر اسی کے ساتھ کوئی دردناک خیال ملا ہوتا ہے۔ شوہر کی یاد عورت کو بہت محبوب بھی لیکن اگر اس یاد کے ساتھ یہ خیال بھی طاری ہو کہ وہ بے وفا نکلا جس کی کبھی بھی امید نہ تھی تو عورت اس یاد سے بھی فطرتاً گھبرا جائے گی۔ مگر وہ گھبراہٹ بھی محض ایک لمحہ کی ہوگی اور

خیال سے یہ فرمایش ہوگی کہ تو اکیلا نہ جا، بلکہ ؎

یا مری نظر کو لے اور اُن کے پاس جا

مجھ سے یا جگر کو لے اور اُن کے پاس جا

بعد کے شعر میں ایک ہی پر تسکین نہ ہوئی، دل کی آئی بدگمانی کا بھی شاید اثر تھا کہ یہ غرض ظاہر ہو ہی گئی ؎

دیکھ لے نظر انھیں دیکھیں جگر کو وہ

آئے تجھ پہ کچھ ترس آئیں اپنے گھر کو وہ

گھر کا خیال آتے ہی ایک ٹیس سی اُٹھتی ہے، اور وہ ایسے بیساختہ مگر پُر لطف الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے ؎

گھر کا نام خاک لوں، بن کے یہ بگڑ چکا ۔ اس پہ اوس پڑ چکی، مٹ چکا، اُجڑ چکا

چھت ٹپکتی ہے تو اُنھہ کون اُسکی لے خبر ۔ رو رہی ہوں میں ادھر، رو رہی ہے وہ اُدھر

آخر کے شعر میں اُنھہ کی لفظ کا مزہ فطرت انسانی سے باخبر لوگ ہی جانتے ہیں۔ گھر اجڑنے کا خیال ہر عورت کو جانگسل ہوتا ہے، مگر شوہر کی جدائی کے آگے وہ بھی کچھ نہیں ؎

میں ہی خاک میں ملی گھر کی فکر خاک ہو

اُن کا ذکر چھوڑ کر، گھر کا ذکر خاک ہو

گھر سے خیال ہٹایا گیا، مگر مکان کی ہر ہر چیز تو شوہر کی یاد دلاتی ہے، دیکھیے وہ پلنگ تو سامنے بچھا دیس پر اب عورت نے بھی دل جلنے والے خیالات سے بچنے کو رہنا چھوڑ دیا

ہے، کیا کھلا رہا ہے ؎

وہ پلنگ انھیں کا ہے اس پر اب ہے تو کون　　خود ہی آکے وہ رہیں، جا کے یہ کہے تو کون

اٹ گیا ہے خاک میں، گرد ہو گیا پلنگ　　آئیں وہ تو مجھ سے لیں اور اک نیا پلنگ

لیجئے پلنگ سے اور سلسلۂ خیالات چلے ؎

ذکر کیا پلنگ کا یہ ذرا سی چیز ہے　　مجھکو اپنی جان تک ان سے کب عزیز ہے

راہ انکی روک لوں اب جو ان کو پاؤں میں　　پتلیوں میں دوں جگہ سامنے بٹھاؤں میں

بال اپنے کھول کر ان پہ جال ڈال دوں　　جب ذرا قدم اٹھیں ان پہ بال ڈال دوں

سلسلۂ خیال یہاں پر آکر شاید تھوڑی دیر کے لئے رک جاتا اور عورت تخیل ہی میں اپنے شوہر کے آنے اور پھر نہ جانے پانے کا مزہ لیتی رہتی، مگر برا ہو اس دل دوز آواز سے چیخنے والی چڑیا پپیہے کا کہ وہ درخت پر آ بیٹھی، عورت فوراً اس طرح اسکی طرف مخاطب ہوئی ؎

کوئی آکے پیڑ پر کہہ رہا ہے پی کہاں　　پی کہیں ہیں میں کہیں کیا کہوں ہے جی کہاں

جی رہی ہوں میں مگر جی مرا ہے پی کے ساتھ　　پاس ہوں کہ دور ہوں، ہیں وہ میرے جی کے ساتھ

فطرت کا قاعدہ ہے کہ وہ درد پیدا کرتی ہے تو اسی کے ساتھ دوا بھی، عورت پر غلبۂ یاس کی انتہا نہ رہی تو فطرت نے اس کے خیالات کا رنگ اس طرح بدلا ؎

آئی ان کی سمت سے اور بو بھی لائی تو　　آج او ہوا ضرور ان کو چھو کے آئی تو

ان سے مل کے آئی ہے، آ تری بلائیں لوں　　تو نے خوش کیا مجھے، لے تجھے دعائیں دوں

جا کے ان کے پاس پھر تو جو ان کو لا سکے　　درد دل کا جا سکے، چین دل کو آ سکے

اودل اور کیا کروں، تیرے درد کا علاج خط میں رکھ کے بھیج دوں تجھکو اُنکے پاس آج
شرط ہے کہ میرے پاس پھر پلٹ کے آئے تو اپنے خون کی قسم دے کے اُن کو لائے تو

آخر میں تھوڑی دیر کے لیے اس خیال سے تسکین ہوتی ہے ؎

یوں نہ آئیں تو یوں عشق کی کشش سے کام
کھنچکے آئیں اس طرح پھر نہ لیں اُدھر کا نام

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ نظم ایک خاص وقت کے جذبات کو نہایت وضاحت سے نہایت موثر طریقہ سے، نہایت سادے، شُستہ الفاظ اور محاورات سے ظاہر کرتی ہے۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فطرت انسانی یورپ میں اور ہے ایشیاء میں اور۔ یہ بالکل غلط ہے جس طرح فطرت حیوانی ایک ہے اُسی طرح انسانی، ایشیاء کی عورت کو ویسا ہی عشق کا جوش ہے جیسا یورپ کی عورت کو جذبہ عشق بنفسہ ایک نہایت شریفانہ جذبہ ہے، اور یہ جذبہ ایسا جذبہ ہے جس کی برابری کوئی دوسرا جذبہ اپنے زوراً قوت میں نہیں کرسکتا۔ ماں بیٹے کی محبت پر یہ غالب آجاتا ہے، انسان کی جسمانی تکالیف اس جذبہ کے دور میں بھول جاتی ہے۔ ایشیا کی عورت اور خصوصاً ہندوستان کی عورت کو جو چیز دنیا میں بے نظیر بناتی ہے وہ وہی قدرت ہے جو وہ اس جذبہ پر حاصل کرتی ہے۔ مثل دنیا کی عورتوں کے عشق کے جذبہ سے وہ بھی پُر ہوتی ہے، مگر یہ جذبہ اُسکا مخصوص ہوتا ہے اپنے شوہر کے ساتھ، اور وہ بھی اس جکڑبندی کے ساتھ کہ اس کا اظہار دوسروں پر ہونے دے۔ اپنے شوہر سے تو وہ اس جذبہ کو چھپا نہیں سکتی

نہ اُس سے چھپانے کی اُس کی زیادہ کوشش ہی ہوتی ہے، لیکن وہ "ڈارلنگ" کہکر اُسے سب کے سامنے نہیں پکارتی۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اُس میں جذبہ عشق نہیں، یا عاشقانہ خیالات سے وہ بے بہرہ ہے فطرت انسانی سے بے خبری ظاہر کرنا ہے۔

جو لوگ جناب شوق کی نظم عالم خیال کو اس عقیدے کے ساتھ دیکھیں کہ محبت یا عشق کا ہر جذبہ غیر شریفانہ ہوتا ہے، اور اُس جذبہ کا اثر ہندوستان کی عورت کے دلی خیالات پر نہ ہونا چاہیے، وہ خود فراموش ہوں گے انسان نہیں، وہ انسانی عالم خیال کے فلسفہ سے نابلد محض ہیں۔

جناب احمد علی صاحب شوق قدوائی نے اپنی اس بیش بہا نظم میں جس موقع اور مناسبت سے خیالات کے مختلف پہلوؤں کا بدلنا دکھایا ہے بلا شبہ وہ اُن کو ایک فلسفی شاعر ثابت کرتا ہے۔

جذبات انسانی کے انکشافات ہی سے آج دنیا میں شکسپیر کا ڈنکہ بج رہا ہے۔ حالانکہ شکسپیر نے بعض بعض جگہ پر انسانی جذبات کو نہایت بے سلیقگی سے دکھایا ہے، اکثر جگہ احمقوں کے منھ میں فلسفیوں کے الفاظ ڈال دیے ہیں کہیں کہیں خیالات بلند بے موقع دکھائے ہیں، جن سے شکسپیر پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ اسکی شاعری اسکی اپنی نہیں، بلکہ یہ کہ اس نے دوسروں کے خیالات جمع کر دیے ہیں، اور موقع بے موقع کا خیال نہ کر سکا۔

ڈاؤڈن نے شکسپیر کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سب سے بڑا شاعر اور سب سے

کم رتبہ شاعر دونوں تھا۔ جو کچھ بھی ہو، بہر حال اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ جسقدر جذبات انسانی کا انکشاف شکسپیر نے کیا دنیا کے کسی دوسرے ایک شاعر نے اُس قدر نہیں کیا۔

لیکن میں ایک شکسپیر سے زیادہ ایک سعدی کو ملک بلکہ دنیا کے لیے مفید سمجھتا ہوں۔ اول الذکر صرف انسان کے جذبات کا انکشاف کر دیتا ہے، آخر الذکر اخلاق و عادات قوم کو درست کرتا ہے۔ ایران، افغانستان اور ہندوستان کے کثیر باشندوں کا تہذیب اخلاق عرصہ دراز تک سعدی کے ہاتھوں رہا۔ شکسپیر کو کبھی نہ اس کا فخر نصیب ہوا، نہ ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کے لیے بھی زیادہ ضرورت سعدیوں کی ہے۔

مسدس حالی نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ شاعری کیسی ہی بودی زبان کیسی ہی بھونڈی کیوں نہ ہو اگر کوئی نظم قوم کی حالت کو ظاہر کرتی ہے تو اس کی قدر بھی قوم کرتی ہے۔ ہندوستان کے باکمال شعرا کے لیے ابھی میدان بہت وسیع ہے "آزادی پر، اتحاد قومی پر، حب الوطنی پر، قتل و غارت کی برائی پر، دیانت اور وفاداری پر، چاپلوسی و خوشامد کی مذمت پر، ترقی علم پر، صنعت و حرفت کی طرف توجہ پر، اپنی تہذیب اور اپنے اخلاق کی برتری پر، غرض کہ سیکڑوں اور ہزاروں ایسے مضامین پر استادان فن قلم اُٹھا سکتے ہیں کہ تمام قوم ان اشعار کو حفظ کرلے، تمام قوم کے دل میں ان اشعار سے ایک حرکت پیدا ہو جائے، جو سوتے ہیں جاگ پڑیں، جو تھک گئے ہیں اُن میں جان تازہ آجاوے۔ بنگال کے شاعر اور نثار اس طرف کچھ زمانہ ہوا مخاطب ہوئے۔ اردو کے شاعروں کو بھی اس طرف توجہ کرنا

چاہیے۔ لیکن اگر اُستادانِ فن نے توجہ نہ کی تو معمولی لوگ ان مضامین کو اُٹھا کر اس کی بھی اسی طرح مٹی پلید کریں گے جس طرح اوّل اوّل "نیچرل" نظموں کی ہوئی تھی۔

یونان کے تمدن کے لیے شاعروں کی ضرورت رہی ہو یا نہ رہی ہو، ہندوستان کو اس وقت فصیح اور بلیغ شعرا کی بہت ضرورت ہے۔ جو کہیں تو رعد کا کام کریں کہیں ابرِ نیسان کا۔ مَیں اکتوبر ۱۹۰۹ء میں ولایت سے آتے وقت مشہور عالم مسٹر ڈبلیو۔ ٹی۔ اسٹڈ (مرحوم) سے ملا اور اُن سے اپنی قلبی دھڑکن کا جو کبھی کبھی انوکھی رائے رکھنے اور سب سے ہمدردی نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے ذکر آیا تو انھوں نے محبت سے اس کا علاج بتایا، اور وہ علاج یہ تھا کہ انھوں نے ایک چھوٹی سی کتاب جس میں انھوں نے خود امریکہ کے شاعر "لاول" کی تصنیفات سے اقتباس کیا تھا، دی جو میری جیب میں رہتی ہے، اور جس سے واقعی میرے قلب کو بارہا تسکین ہوئی ہے۔ میں مثلاً چار شعر اس سے ترجمہ کر کے لکھتا ہوں۔ وہو ہذا

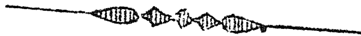
وہ غلام ہیں جو گرے ہوؤں اور کمزوروں کے واسطے زبان ہلانے سے ڈرتے ہیں۔ وہ غلام ہیں جو اس ڈر سے کہ لوگ نفرت کریں گے، تمسخر کریں گے، گالیاں دیں گے اس حق کو ظاہر کرنے میں جو اُن کے دلوں میں ابھرا ہو خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ وہ غلام ہیں جو اسکی جرات نہیں رکھتے کہ دو تین (حق پر ہونے والے) آدمیوں کا ساتھ دیں

میری حقیر رائے میں ہندوستان کو شکسپیر سے زیادہ لاول کی ضرورت ہے۔

ہماری قوم گری ہوئی ہے۔ اس کے احیاء میں شاعر بہت کچھ حصہ لے سکتے ہیں۔ قومی کمزوریوں کا انکشاف کریں، قومی اخلاق کو بلند کریں، ایک طرف اگر وفاداری اور اطاعت کا

بیج بوئیں، تو دوسری طرف قومی عزت اور تہذیب سے زندگی بسر کرنے پر آمادہ کریں قوم کو خودداری کے سبق دلنشین طریقے سے دیں۔ فقط

مشیر حسین قدوائی



دوسرا رُخ

عورت اپنے شوہر کے آنے کی امید میں ہے، شوہر کا خط عذر کے ساتھ پردیس سے آیا کہ وہ ابھی نہیں آسکتا ہے۔ عورت بے چین ہو کے شوہر کو خط لکھ رہی ہے، اور اپنے خیالات ظاہر کرتی ہے:-

پا کے تمھارے خط کو آج، دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور
دل میں بھڑک کے غم کی آگ، جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور

آنے کا آسرا کہاں، یاس سے وہ بدل چلا
دل مرا آنسوؤں کے ساتھ بن کے لہو نکل چلا

در کی طرف تھی جو نگاہ، یاس سے اب زمیں پہ ہے
ہاتھ کبھی جگر پہ ہے، اور کبھی جبیں پہ ہے

ضعف سے جسم لٹ چلا، روح بدن سے ہٹ چلی
چہرے کا رنگ کٹ چلا، نبض کی چال گھٹ چلی

خط سے پڑی جگر پہ چوٹ، داغ ہرے ہوگئے ہیں آج
تم سے ہزار ہو گلے، دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہی تمھارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اسکو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار، چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا ہے خط، کاش وہ انگلیاں ملیں
میرا خیال چوم لے، جائے وہیں جہاں ملیں

خود بھی گئے تم اور چین، چھین کے مجھ سے لے گئے
مجھکو مریض بنا گئے، مجھکو جنون دے گئے

سب کے جگر میں خون ہے، میرے جگر میں درد ہے
سب کا شباب لال ہے، میرا شباب زرد ہے

ایک تمھیں تھے میرا عیش، بن گئے غم تو کیا کروں — پہلے تمھیں تھے میرا چین، اب ہو ستم تو کیا کروں

عیش کو کھو گئے ہو تم، آؤ تمھیں تو پھر ملے — چین کو لے گئے ہو تم، لاؤ تمھیں تو پھر ملے

تم نہ ستم کرو، تو کیوں، دل مرا بے قرار ہو — میں نہیں چاہتی، کہ تم میرے گنہگار ہو

کیا میں خدا کے سامنے، تم کو سزا دلاؤں گی — اپنی وفا کے نام کو، خاک میں کیوں ملاؤں گی

چھپ گئے پتلیوں سے تم، آنکھ کو نظر نہ آؤ گے — یہ تو کہو کس طرح، دل سے نکل کے جاؤ گے

دل میں چھپے ہو تم مگر، چوس رہے ہو خون کو — سر میں خیال بن کے تم، دیتے ہو نشہ جنون کو

بن کے لہو تمھاری یاد، دوڑ رہی ہے جسم میں — جان یہی ہے جسم میں، روح یہی ہے جسم میں

دم مرا لو سے بڑھ کے گرم، دل مرا بے حواس ہے — جسم میں جل گیا لہو، اور ابھی تپ کو پیاس ہے

مانگتی ہوں تم سے بھیک، دو تو کوئی ضرر نہیں — چاہتی ہوں تم سے رحم، مال نہیں یہ زر نہیں

رحم سے میرے دل کو چین، دو گے تو دیکھو گے تم — اپنے خدا سے یہ ثواب لو گے تو لے سکو گے تم

اپنا خیال تک نہیں، چاہ کے جوش میں مجھے — ایک تمھاری یاد ہاں، لاتی ہے ہوش میں مجھے

آئنے میں ہے ایک چیز، چین مجھے اسی سے ہے — اُلفت ہے تو اِسی سے ہے۔ اور نہیں کسی سے ہے

دیکھتی رہتی ہوں اسے، پیار کے ساتھ بار بار — اس کی بلائیں لینے کو بڑھتے ہیں ہاتھ بار بار

ہے یہ تمھاری ہی شبیہ، اور یہ میری جان ہے — اس میں تمھارا حسن ہے، اس میں تمھاری شان ہے

جان تو میری ہے مگر، کچھ نہیں بولتی تو کیوں — دیکھتی ہے مجھے ضرور، منہ نہیں کھولتی تو کیوں

شکل ہے یہ تمھاری ہی، تم ہو خفا، تو یہ بھی ہے — دور تم، اور چپ شبیہ، وہ ہے خفا تو یہ بھی ہے

تم نظر آ ہی جاتے ہو، لے وہ خیال ہی سہی — کچھ نہیں، تو شبیہ سے، صرف جمال ہی سہی

قسمت سے مرے نصیب میں شاید ابھی کرم نہیں
وہ ہیں بڑی ہی خوش نصیب ہجر کا جنکو غم نہیں

رہتی ہیں شوہروں کے ساتھ خوب سنگار کرکے وہ
ہنستی ہیں کھلکھلا کے وہ ہنستی ہیں بن سنور کے وہ

رخ پہ شباب کی بہار رنگ سے دونوں گال لال
مانگ پہ موتیوں کی [illegible] ہونٹھ لال لال

وہ جو پلنگ کے پاس ہیں شوخ کلوٹی ہے پڑی
ہونٹھ جو ہنسنے کھل پڑے کلی کی [illegible]

دل کے لئے تو کھا گئے ہیں دل کو لپیٹ لیجئے
دل میں تجھے چھپنے دو لوٹئے [illegible] لیجئے

کچھ تو ہیں خود بھی من میں [illegible] ہنستی ہیں کچھ ادا کے ساتھ
کچھ تو ہے حسن قدرتی ہنستی ہیں کچھ ادا کے ساتھ

لٹنے کو شوہروں کے دل لٹتے ہیں بات بات پہ
حسن ہی کچھ بنا ہے ایسا ناز میں ہی گھات ہے

مجھکو ہے غم تو پھر سنگار کون کرے تمھیں کہو
دیکھ کے حسن تجھکو پیار کون کرے تمھیں کہو

رکھتے نہیں یہ ہونٹھ رنگ رکھتے نہیں ہیں گال رنگ
تم ہی ہو آنکھ میں ہے قدرت کا رنگ لال رنگ

کاجل آنسے کروں خضاب اسکی طرف نگاہ ہے
جتنا ہے آنسوؤں کے ساتھ ہو گئی [illegible] ہے

خاک میں جھڑ گئیاں ہیں جی کو جلا رہی ہیں یہ
جب زمیں جا پڑیں بجلیاں آگ لگا رہی ہیں یہ

ناہیں ہیں بچے بالیاں خار ہے چھپ کے دھمکیاں
کسکو دکھاؤں میں کہ ہاتھ میں پہنے کی انگلیاں

دینی ہے داغ آرسی میں تو چھوڑ دوں گی اب اسے
آنکھ پر زرد رو نظر آتی ہوں میں جب اسے

بس لے تو ناہیں جکی دل پہ گراں ہے زیور آب
تم نہیں دیکھتے سنگار خاک پڑے یہ کچھ ہیں اب

بکس ہیں اسکو کرکے بند سب میں تمھیں کو بھیجدوں
نقشہ تمھارے ہی لیے اب میں تمھیں کو بھیجدوں

مجھکو تو چاہئے نہیں شوق سے آکے دیکھنا
چاہتے ہو جسے وہاں اسکو بٹھا کے دیکھنا

طنز سے کیا یہ کہہ اٹھی شوخ مری زباں ہوئی
ہے یہ زباں گناہگار میں نہیں بدگماں ہوئی

تم میں وفا ہو، یا نہ ہو میں یہ کہوں گی ہی ضرور — ہاں یہ کہوں گی راہ کو روکے ہے کوئی شے ضرور

آؤ نہ آؤ، میں شباب تم پہ نثار کر چکی — تم مجھے پیار کر چکے، میں تمھیں پیار کر چکی

کس سے کہوں میں دل کا بھید سوچ میں پڑی ہوئی — لیٹ گئی تو آیا سوچ، بیٹھ گئی کھڑی ہوئی

ہوتی ہوں تنگ کروٹیں غم سے بدل بدل کے میں — کاٹتی ہوں، سٹرن کی طرح، رات ٹہل ٹہل کے میں

چھوڑ کے منھ، جو کوئی چیز، مانگ اٹھی تو زک ملی — آئے پسند ایسی چیز، مجھکو نہ آج تک ملی

نیل کو میں ترس گئی، بال مرے چٹک گئے — میں ہی لٹی، تو بال کیا، اُنھ وہ بلا سے کٹ گئے

جیسی پھنسی بلا میں اب، اور کبھی پھنسی نہیں — دل میں کبھی خوشی نہیں، منھ پہ کبھی ہنسی نہیں

میری خوشی کی زندگی، عقد سے پیشتر رہی — ساتھ تمھارا کیا ہوا، چھوٹ کے تم سے مر رہی

جذب کے ولولے ہزار، یہ مجھے سب عذاب ہیں — سب مرے دل کا جوش ہیں سب مرا اضطراب ہیں

کیوں میں عذاب کہہ اٹھی، چوک ہے یہ قصور ہے — ہجر میں جذب ہی سے ہے، درد کو جو سرور ہے

جذب میں کاش ہو یہ زور، جو تمھیں لائے کھینچ کر — گھر مری پتلیوں کے ہیں انہیں بٹھائے کھینچکر

چاہ کے رخ کھنچی ہوں میں، کاہ ربا سے جیسے گھاس — دل تپش سے بیقرار، تیز ہوا سے جیسے گھاس

کاہ ربا ہے گھاس کو، کھینچتی ہوں ہزار بار — جذب کو میں دکھاتی ہوں زورِ کشش کا بار بار

اب بھی نہ یہ کرے کشش، تو اس سے کوئی کیا کرے — جذب کا نام جذب ہی پھر نہ رہے خدا کرے

دل مرا لیکے ہو تم، اسکو نہ چھوڑ دوں گی میں — توڑ چکے جو تم تو خیر، لاؤ تو جوڑ لوں گی میں

کانپ کے دل میں لاؤ خوف، اپنے خدا کا تم کبھی — اپنی وفا سے دو جواب، میری وفا کا تم کبھی

صرف تمھاری دید کی، تم سے ہوں طالب اور بس — صرف تمھاری آرزو مجھ پہ ہے غالب، اور بس

ہجر کے تمھاری شکل سے، دل نہ ہٹا، نہ ہٹ سکے
اور کسی طرف کبھی دھیان ہٹا، نہ ہٹ سکے

جھوٹے جو میں ذرا لکھوں، تو ہو خفا مرا خدا
چاہ کو مجھسے چھین لے دے یہ مجھے سزا خدا!

توبہ! یہ کیا میں بک گئی! توبہ یہ کیا میں کہہ گئی
چاہ تمھاری جب چھنی، پھر تو میں کچھ نہ رہ گئی

چاہ کا نام سحر ہے، تم پہ اثر کرے یہ کاش
جذب سے کھینچکر تمھیں، رُخ کو ادھر کرے یہ کاش

غم سے دبی خوشی، مگر چاہ کی یہ خطا نہیں
ہجر ہے، جسکی چوٹ سے درد کی انتہا نہیں

ضبط کی کوئی حد بھی ہے، چاہ کو میں چھپا چکی
غم کی تو کوئی حد نہیں، کم نہوا میں کھا تھکی

اشک تو بہتے ہیں، مگر اشک نہیں نگاہ میں
ڈھلکے یہ موتیوں سے ہیں، مجھکو تمھاری چاہ میں

آنچل اگر ہو تر، تو میں خشک کروں نچوڑ کر
ساس کے پاس جاؤں تو مُنھ کو ادھر سے موڑ کر

رہتی ہوں سب سے میں الگ، تا کہ نہ تاڑ جائیں لوگ
روتی ہوں سب سے چھپکے میں، تاکہ نہ دیکھ پائیں لوگ

آتی ہیں ہنسیں، مگر مجھ میں نہیں ہنسی مری
شرم سے کیا کہوں کہ "وہ" لیگئے دل لگی مری

میں نہ کہوں زباں سے کچھ کھلتا ہے درد رنگ سے
دیکھتی ہیں وہ غم کی شکل چہرے کے زرد رنگ سے

پوچھتی ہیں تو کیا کہوں، چھیڑتی ہیں تو کیا کروں
سادھ کے چپ لہو کے گھونٹ بیٹھی ہوئی پیا کروں

جھولنے کو جو وہ کہیں، جاؤں میں اُٹھ کے جبر سے
گائیں تو گاؤں انکے ساتھ، غم کو چھپا کے صبر سے

ساون اگر میں گاؤں بھی، تو وہی جسمیں درد ہو
راگ میں کھینچے عورت آہ، درد جب اسکا مرد ہو

گانے کا دم ہی کس میں ہے تان نکلتی ہی نہیں
سانس میں زور ہی نہیں، کھُلکے یہ چلتی ہی نہیں

پہلے لچک کے ناز سے، کھاتی تھی میں ہزار بل
تم نہیں اب تو ضعف سے کھاتی ہوں بار بار بل

ضعف کا حال کیا کہوں، زور کو رنج کھا گیا
آہ کے ساتھ بار ہا دل مرا مُنھ تک آگیا

پال گئے ہو تم چکور، ہوتی ہوں اس سے شاد میں　　لے کے اسی کو گود میں کرتی ہوں تمکو یاد میں

چاندنی رات میں مگر دیتے ہو غم ضرور تم　　اسکی نظر میں چاند ہے، میری نظر سے دور تم

چاندنی رات سرد ہے، کرتی ہے دل کو سرد وہ　　تم مرے چاند، تجھ سے دور، میرے لیے ہے درد وہ

شب کو پتنگے آتے ہیں، گرتے ہیں وہ چراغ پر　　اور جلاتے ہیں مجھے دیتے ہیں داغ داغ پر

پاؤں تمہیں تو ہوں نثار، گرد پھروں اسی طرح　　تجھ سے ملوں اسی طرح، تم پہ گروں اسی طرح

تم مجھے کیوں نہ لے گئے، چل دیے منہ کو موڑ کر　　چل دیے مجھکو چھوڑ کر، چل دیے دل کو توڑ کر

ساس کو مجھ پہ رحم کیا، ورنہ یہ وہ کٹتیں تمھیں　　شہ کو مجھ پہ کیا ترس، ورنہ یہ تو کہتیں تمھیں

پاک محبت اور میں ملنے کی فکر کیوں نہ ہو　　جوش وفا کا اور دل، چاہ کا ذکر کیوں نہ ہو

جنکے دلوں میں کھوٹ ہو، انکو کہاں وفا سے کام　　مجھ میں وفا ہے اسلیے، غم میں پڑا خدا سے کام

ہجر کی کالی شبوں کے ساتھ، یہ مری زندگی ہے دن　　مجھکو سزا یہ کیوں ملی، سوچ یہی ہے رات دن

کی نہیں میں نے کچھ خطا، کی ہو تو بخش دو تم　　مجھکو نہ دیکھنا، مگر خیر سے گھر تو آؤ تم

آؤ جو تم تو رنج ہے میں آنچل اٹھا کے ڈال لوں　　آئیں تو پھر رنج کچھ نہیں جیا کے دیکھ بھال لوں

ابر امنڈ کے آ گیا، رو دوں گی اسکے ساتھ میں　　اپنے جگر کے خون سے دھوؤں گی اسکے ہاتھ میں

بول اٹھا وہ میرا مور، ہاتھ سے اسکے دل گیا　　مجھکو نہ مل سکو گے تم، اسکو تو ابر مل گیا

گھر میں ہے پیڑ انار کا، اسپہ پپیہے آتے ہیں　　دیکھ کے میری بیکسی مجھ پہ ترس وہ کھاتے ہیں

وہ نہیں بیٹھتے کبھی، پیڑ کے اوپر آکے چپ　　تم کو پکارتے ہیں روز، شرم سے مجھکو پاکے چپ

ابر اٹھے تو میں کھڑی روتی ہوں خوف کھا کے میں　　دیکھ کے بجلیوں کی آگ، گرتی ہوں تلملا کے میں

تم مرے پاس ہو تو پھر خوف مجھے ذرا نہ ہو — وہم سے ڈر ہے، ڈر سے وہم جب کوئی دوسرا نہ ہو

عورت اگر بنی ہے تو شرم کی اسمیں مری خطا نہیں — یہ تو کہو کہ تم پہ کچھ میرا بھی حق ہے یا نہیں

پاؤں خدا نے کیوں دیے کیا اسی صحن کے لئے — سب مرے دل کے حوصلے مجھ سے چھپانے کے لئے

پردہ میں رہ کے عورتیں مرتی ہیں گو قضا نہ ہو — شرم کا حق ادا کریں چاہ کا حق ادا نہ ہو

اشک مرے ٹپک پڑے خط ہوا تر میں کیا کروں — بھیگ کے کچھ بگڑ گئے حرف مگر میں کیا کروں

گندھ گیا آنسوؤں کا ہار خوش ہو نہ دیکھ کر اسے — بن گیا موتیوں کا ہار پہنئے تمھاری یاد سے

صبر سے گذری موت میرا تو جگر رو چکی ہیں — اپنے بدن کی آگ سے آپ ہی جل مر چکی ہیں

مجھکو یقین ہے کہ تم آکے مجھے نہ پاؤ گے — آکے نہ پاؤ گے تو کیا میری لحد پہ آؤ گے

فاتحہ بھی پڑھو گے تم ہاتھ اٹھا کے یا نہیں — روح کو خوش کرو گے تم پھول چڑھا کے یا نہیں

سبزے کو دیکھنا ضرور سمجھو یہ وہ بار ہو نہ جائے — نرم رہے ہرا رہے سوکھ کے خار ہو نہ جائے

جان لبوں سے دے چکی تم کو پیام اور بس
سنتی ہوں شوق ہیں وہیں انکو سلام اور بس

دوسرے رخ پر ایک نظر

اس میں کچھ شبہ نہیں اور میں حضرت قدوائی بیرسٹر کے لفظ لفظ سے اس بات میں متفق ہوں کہ فطری جذبات کا نثر میں ادا کرنا مشکل ہے نہ کہ نظم میں لیکن میں صرف قلم ہی سے نہیں بلکہ دل سے کہہ رہا ہوں کہ حضرت شوق قدوائی نے جو کامیابی نیچرل جذبات کے دکھانے اور اصلی خیالات کے ادا کرنے سے نظم کی دنیا میں حاصل کی ہے وہ آج ہندوستان میں انھیں کے دماغ اور انھیں کے قلم کے حصّہ میں ہے، اور انھوں نے صرف شاعری نہیں کی ہے بلکہ اخلاق اور معاشرت کا فلسفہ ان نظموں میں بھر دیا ہے۔

جو بڑی خوبی ان نظموں میں ہے وہ یہ ہے کہ مرد کا قلم عورت کا دل بنکر بول رہا ہے یہ ایسی لطافت ہے جسکی داد بہ نسبت مردوں کے خوش فہم عورتوں کے دلوں سے اور بھی زیادہ ملنا چاہیے۔ وہ خوش ہوں گی کہ اُنکے خیالات اور جذبات کس لطافت، کس فصاحت اور کس عفت کے ساتھ ان نظموں میں دکھائے گئے ہیں، اور پاکدامنی کے ساتھ وہ محبّت اور وفا جو ہندوستان کی نیک سرشت عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ رکھتی ہیں اور جو صرف ایشیا کی عورتوں کا خاص جوہر ہے، اسکو یہ نظمیں کیسے کیسے دل آویز پیرایوں میں ظاہر کر رہی ہیں گویا اس بات کی قوی شہادت دے رہے ہیں کہ ہماری عورتوں کے پاکباز دل اپنے ایمان

اور اپنی تمناؤں کو صرف شوہروں ہی کی صورتوں تک محدود رکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے انگریزی کی نظموں، خصوصاً شکسپیر کے ڈراموں کو دیکھا ہے اور جن کی نگاہیں سنسکرت اور بھاشا کے دلکش مضامین پر پڑی ہیں، وہ نیچرل جذبات اور انکی اداؤں کا لطف زیادہ پا سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی عالم خیال کی نظمیں خیالات کی ایسی وسعت اور ایسی کششوں کے ساتھ اگر کسی یوروپین شاعر کے قلم سے انگریزی زبان میں نکلتیں تو یورپ کے اکثر حصے ان کی تعریفوں سے گونج اٹھتے۔ اور شاعر کا دامن امید ہر قسم کی داد کے پھولوں سے بھر جاتا، بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ایسی نظمیں انگریزی لباس میں نظر آئیں تو یورپ کی آزاد منش عورتیں ہندوستان کی پاکباز عورتوں کے خیالات سے سچی محبت اور وفا کا سبق لیں۔

حضرت قدوائی بیرسٹر کا یہ خیال صحیح ہے کہ ان نظموں سے بیشتر اردو میں، بلکہ انگریزی میں بھی، ایسی مسلسل بے نظیر نظموں کا وجود نہیں پایا جاتا۔ فارسی کا ذکر ہی فضول ہے، البتہ عربی میں علامہ آزاد بلگرامی نے سنسکرت اور بھاکھا کے خیالات لیکر فطری جذبات کے نقشے کھینچے ہیں، مگر چھوٹے چھوٹے۔ انگریزی کی نیچرل نظمیں عموماً اور رنگوں کی ہیں، یورپ کی عورتیں مثل ہندوستان کی عورتوں کے اپنے خمیر میں وہ جوہر لطیف کم رکھتی ہیں جو انکو ایسے جذبات کے اظہار اور فراق کے ایسے صدمات کی تصویر کھینچنے پر مائل کرے، جن کی حالتیں ان نظموں سے پیدا ہو رہی ہیں، لہذا میری طرح ملک کے ذی فہموں کو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اردو میں ایسی بلند اور دلچسپ نظموں کے موجد حضرت شفق قدوائی ہی ہوئے۔

اب میں نظم پر نگاہ ڈالتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ یہ ہندوستان کی ایک فرقت نصیب عورت کا خط ہے۔ وہ شوہر کی آمد آمد کا انتظار کر رہی تھی، اسی حالت میں پردیس سے شوہر کا خط آیا کہ وہ ابھی نہیں آسکتا ہے۔ عورت بے چین ہو کے اسکو خط لکھتی ہے، اور اپنی بیقراری کے اظہار کا سلسلہ یوں شروع کرتی ہے ؎

پا کے تمھارے خط کو آج دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور
دل میں بھڑک کے غم کی آگ جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور

خط کو پا کے وہ اور بھی تڑپی، اور مایوس ہو کر کہتی ہے ؎

آنے کا آسرا کہاں یاس سے وہ بدل چلا دل مرا آنسوؤں کے ساتھ بن کے لہو نکل چلا
در کی طرف تھی جو نگاہ یاس سے اب زمیں پہ ہے ہاتھ کبھی جگر پہ ہے اور کبھی جبین پہ ہے

یاس کی تصویر شاعر نے جس فصیح زبان میں دکھائی ہے یہ اس اصلی تصویر کی جانب خیال کو کھینچے لئے جاتی ہے جس پر یہ دردناک حالت طاری ہوا اور مدتوں کی جدائی کے بعد امید و حسن کی امید کا خاتمہ کر دے۔ ان دونوں شعروں میں پہلے شعر کا دوسرا مصرع زبان کی لطافت کے ساتھ شاعرانہ بلاغت کو اعلیٰ پیمانے پر ثابت کر رہا ہے۔

دوسرا شعر ایک ایسی صورت حال کا نظارہ ہے جس سے تین شکلوں پر نگاہ پڑتی ہے (۱) در سے نگاہ یاس کا زمین کی طرف آرہنا جو ایک فطری حالت ہے (۲) کبھی جگر پر ہاتھ ہونا تاکہ درد اور بے چینی اسکو سنبھالے (۳) کبھی جبین پر ہاتھ کا ہونا جو حیرت کا نقشہ یا درد کی حالت میں سر کے سنبھالنے کا طریقہ ہے۔ یہ شعر اپنی فصاحت کے ساتھ شاعر کی اس قوت شاعرانہ کو ظاہر

کر رہا ہے جسکی حد انتہائے قوت شاعری ہے، اور اس امر کی دلیل ہے کہ اس شعر کا نظم کرنے والا فطری اداؤں کا نقشہ کھینچنے میں کامل دستگاہ رکھتا ہے۔

پانچواں شعر جسکو مَیں آگے لکھتا ہوں اس کا دوسرا مصرع عالم سخن سنجی میں جو شان دکھا رہا ہے اس کا اندازہ وہی سخن فہم کر سکتے ہیں جنکی نگاہیں شاعری کے بلند درجوں پر پہنچی ہوئی ہیں ؎

خط سے پڑی جگر پہ چوٹ زخم ہرے ہوئے ہیں آج
تم سے ہزار ہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

زخموں کا ہرا ہونا ایک معمولی محاورہ ہے لیکن یہاں اس نے اپنے معمولی لطف سے بہت بڑھکے لطف دیا ہے۔ اوپر کے اشعار امید کے بعد یاس کو ظاہر کر چکے ہیں اب یہ مصرع کہتا ہے کہ فراق کے پچھلے زخم جو امید سے بھر چلے تھے اب یاس سے بھرے ہوئے، خط کی چوٹ کھاکے ہرے یعنے تازے ہو گئے۔ دوسرے مصرع کی شرح کہاں تک لکھی جائے، "تم سے ہزار ہا گلے" کے الفاظ ایسے ہیں جن کے وسیع مطالب کو دل سمجھ سکتا ہے مگر زبان نہیں ادا کر سکتی۔

آگے چل کر قادر الکلام شاعر نے درد جگر کی حالت جس فصاحت، لطافت اور بلاغت کے ساتھ دکھائی ہے، یہ انہیں کے دماغ اور قلم کا حق ہے، گویا درد نصیب عورت یہ کہہ رہی ہے ؎

سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے
سب کا شباب لال ہے میرا شباب زرد ہے

جو شاعرانہ کمال اور فصیحانہ لُطف اس شعر میں ہے، وہ صاف کہہ رہا ہے کہ زبان، بندش، خوبیِ مضامین، غرض نظم کے تمام اوصاف حضرت شوق قدوائی، کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں شباب کے زرد ہونے کا رنگ اس پرچسپ اثر کے ساتھ جمتا ہے، اُسکی حالت سخن فہموں کے دلوں سے پوچھی جائے۔ مصرعہ اول کو مصرعہ ثانی سے جو ربط ہے یہ کمال فن کی قطعی شہادت ہے، یعنی "سب کے جگر میں خون ہے" اس سبب سے "سب کا شباب لال ہے" اور "میرے جگر میں درد ہے" اس سبب "میرا شباب زرد ہے" درد کا خاصہ ہے کہ چہرے کی رنگت کو بدل دیتا ہے۔

اوپر کے اشعار میں اگرچہ پاکباز عورت اپنے شوہر کے ساتھ محبت کا اظہار اُس کے خط کو بار بار چوم کے اور اپنے خیال کو اسکی انگلیاں چومنے کے لیے بھیج کے بہت دلچسپ پیرائے میں کرچکی ہے جن اشعار کو مَیں نے طوالت کے خیال سے نہیں لکھا، لیکن جو اشعار آگے لکھوں گا ان کے سخن گسترانہ مذاق کی خوبیوں نے مجھے وہ لطف دیا ہے جسکو مَیں قلم کی زبان سے نہیں ادا کرسکتا۔ عورت کی بیقراری کا سبب فراق ہے اور فراق کو وہ اپنے شوہر کا ستم قرار دیتی ہے، اور اخلاقی فلسفہ سے کام لے کے کہتی ہے ؎

تم نہ ستم کرو تو کیوں، دل مرا بے قرار ہو	مَیں نہیں چاہتی کہ تم میرے گنہگار رہو
کیا مَیں خدا کے سامنے تم کو سزا دلاؤں گی	اپنی وفا کے نام کو خاک میں کیوں ملاؤنگی

پہلے شعر کا دوسرا مصرع اگر موتیوں کے ساتھ تولا جائے تو مصرعے ہی کی قیمت بڑھی رہے زبان ہے کہ فصاحت کا دریا ہے جسکی ایک لہر سے یہ مصرع نمودار ہوا "میں نہیں چاہتی کہ"

لطف اوا نھوں کے دلوں سے کوئی پوچھے۔ انسان پر ظلم کرنا حق العباد میں داخل ہے
اس خیال کو پیش نظر رکھ کے شوہر کی بھی خواہ عورت اس کو اپنا گنا ہگار بنانا نہیں چاہتی
یہ کیوں؟ اس لیے کہ خدا کے سامنے وہ اسے سزا نہیں دلا سکتی محبت کا مقتضا یہی ہے،
اور اپنی وفا کو وہ برباد کرنا نہیں چاہتی، جو اسکی زندگی کا سرمایۂ ناز ہے، پھر وہ اپنے
خیال کو جذب کی طرف پھیرتی ہے اور کہتی ہے ؎

چھپ گئے پتلیوں سے تم، انکو نظر نہ آؤ گے
یہ تو کہو کہ کس طرح دل سے نکل کے جاؤ گے

یہ محبت آمیز طنز، دل کے جذب کو جس خوبی سے ظاہر کر رہی ہے، میرے خیال میں اس سے
زیادہ لطیف پیرایہ قلب کی قوت مقناطیسی کے اظہار کا اور ہو ہی نہیں سکتا۔
جذب کو تو ظاہر کر دیا اور یہ تو کہہ دیا کہ تم کو دل سے یوں نہیں نکلنے دوں گی، مگر فراق
کی کاہشوں کا دکھانا بھی ضروری تھا تاکہ شوہر کو ترس آجائے، تو اب کیا کہتی ہے۔

دل میں چھپے ہو تم مگر چوس رہے ہو خون کو
سر میں خیال بن کے تم دیتے ہو شہ جنون کو

اپنے خشک اور زرد ہونے کی صورت پہلے مصرعے سے ظاہر کی ہے اور دیوانگی کی حالت
دوسرے مصرعے سے۔ آخر فراق کی گرمی سے دل جل اٹھا تو بے حواس ہو کے کہہ اٹھی ؎

دم مرا لو سے بڑھ کے گرم، دل مرا بے حواس ہے
جسم میں جل گیا لہو، اور ابھی تپ کو پیاس ہے

اس شعر کا دوسرا مصرع شاعرانہ نازک خیالی اور فصاحت کے ساتھ بلاغت کے عرش پر جا پہنچا ہے، اور کس لطف سے اس خیال کو ظاہر کر رہا ہے کہ بدن میں خون نہیں رہا لیکن تپ کی پیاس نہیں بجھی یعنی میں نہایت نقیہ ہو گئی ہوں تپ اب بھی مجھے گھیرے ہوئے ہے۔

کیسا ہی رنج اور کیسا ہی غم کیوں نہ ہو فطرت کا یہ مقتضا ہے کہ کسی نہ کسی وقت دل کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی تسلی دینے والا خیال پیش آجاتا ہے، ایسا نہ ہو تو رنج و غم کا سلسلہ زندگی کی ضرورتوں سے انسان کو مبہوت رکھ کے نفس کے سلسلے کو منقطع کر دے۔ فراق کی کاہشوں اور پیاس کی کاوشوں سے شوہر کی وارفتہ عورت کو تشفی دینے کے لیے اگر کوئی چیز اس کے سامنے ہے تو وہ یہ ہے جس کو وہ یوں بتا رہی ہے ؎

آئینے میں جو ایک چیز، چین مجھے اسی سے ہے
اُنس ہے تو اسی سے ہے، اور نہیں کسی سے ہے

وہ اپنے اُنس کو صرف اسی چیز پر منحصر کرتی ہے۔ یہ اسکی عفت، اسکے نازک خیال اور اس کے پاکیزہ نفس کی قطعی شہادت ہے، یہ وہی اوصاف ہیں جو ایشیا کی پاکباز عورتوں کے واسطے سرمایۂ ناز ہیں اور جنکو قادر الکلام شاعر نے "اُنس کا" "اسی" پر انحصار کرکے "اور نہیں کسی سے ہے" ان چند الفاظ سے نہایت فصاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ اب عورت اپنے اُنس کی مزید شہادت قول سے بڑھکر اظہار محبت کے فعل سے یوں پیش کرتی ہے ؎

دیکھتی رہتی ہوں اسے پیار کے ساتھ بار بار
اس کی بلائیں لینے کو بڑھتے ہیں ہاتھ بار بار

ادا شناس خیال فرما سکتے ہیں کہ یہ شعر جس میں سلیس اور فصیح الفاظ کے ساتھ لطافت اور عورت کی فطری حالت کی خوبیاں بھری ہوئی ہیں، عورت کی زبان سے نکل کر کتنا لطف دیسکتا ہے۔

اب عورت اپنے خیال کو چکر میں ڈال کے، کہ آخر ہے وہ کیا چیز، اسکو ان پاکیزہ الفاظ میں ظاہر کرتی ہے ؎

ہے یہ تمھاری ہی شبیہ، اور یہ میری جان ہے
اسمیں تمھارا حسن ہے، اس میں تمھاری شان ہے

یہ شعر کیسی سیدھی سادی اردو میں ہے، مگر کتنا پُر اثر اور کس قدر بامزہ ہے، لطیف بندش اور فصیح الفاظ کے علاوہ آپ اس بات کو دیکھئے کہ محبت سے بھری ہوئی عورت کی زبان سے نکلکر وہ شوہر کے دل کو کتنی جنبش دے سکتا ہے۔ پھر آگے چلکر عورت اپنے دل کی تسکین کا اظہار کیسے دلآویز طریقے سے کرتی ہے، اور کس پیاری ادا سے کہتی ہے ؎

تم نظر آہی جاتے ہو، اے وہ خیال ہی سہی
کچھ نہیں تو شبیہ سے صرف جمال ہی سہی

اس شعر میں علاوہ اور تمام نزاکتوں کے لفظ "اے" کا لطف وہی لوگ پا سکتے ہیں جو بول چال کی خوبیوں اور اسکی نزاکتوں سے واقف ہیں، یہ ایک لفظ ثابت کر رہا ہے کہ جس نے اس شعر کو کہا وہ زبان پر قادر، اس کے نکات پر حاوی، اور ادا بندی پر پورا قابو کیے ہوئے ہے۔

عورت تصویر سے صرف خیالی تشفی تو حاصل کرتی ہے لیکن فراق کا صدمہ جو اُس کے
دل میں نشتر چبھو رہا ہے۔ اس سے چین اُسی وقت پا سکتی ہے جب شوہر کو حسرت زدہ
آنکھوں سے دیکھ لے۔ ایسے نظارے کی امید یاس سے منقطع ہو چکی تو وہ مضطرب
ہو کے نہایت درد انگیز آواز سے کہہ اُٹھی ؎

تم سے مرے نصیب میں شاید ابھی کرم نہیں
وہ ہیں بڑی ہی خوش نصیب ہجر کا جنکو غم نہیں

جنکو خوش نصیب کہا اور بہت صحیح کہا اُنکی خوشیوں اور اُنکے خوش دل کے نقشے کھینچ کے
وہ اپنے شوہر کو دکھاتی ہے تاکہ ان کی خوشیوں سے اپنے صدموں کا اندازہ کرے
اور کہتی ہے ؎

رہتی ہیں شوہروں کے ساتھ خوب سنگار کرکے وہ
ہنستی ہیں کھلکھلا کے وہ منتیں بن سنور کے وہ
وہ جو چہک کے بولتی ہیں شاخ گلو تکی بن بڑی
منہ سے جو ہنسکے کھل پڑے اُنگلی کی کلی سی کھل پڑی
بال کھلے تو کھا گئے بل دل کو لپیٹ لے گئے
دل میں تھے جتنے ولولے سب کو سمیٹ لے گئے
کچھ تو ہے خود دلہن میں کیسی تھی لگن کچھ ادا کے ساتھ
کچھ تو ہی حسن تھی فطرتی نبھی کچھ ادا کے ساتھ

ان چار اشعار میں دوسرے شعر کے الفاظ کی نزاکت تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے کا
اور دلوں کو سمیٹ لے جانے کی ادائے شاعرانہ اور چوتھے شعر میں فطری حسن کے ساتھ
بن سنور کے اترانے کی تصویریں جس خوبصورتی سے کھینچی گئی ہیں انکی داد اُن ادا فہموں
کے دل دیں جن کا سخن سنجانہ مذاق دلربایانہ اداؤں کے لطف سے آشنا ہے چوتھے شعر

آخری مصرع قدرتی حسن کے ساتھ بناوٹ کی ادا کو جو عورت کے حسن میں دلفریبی کی ایک خاص شان ہے کس خوبی سے ظاہر کر رہا ہے۔

خوش نصیبوں کی صورتیں دکھانے کے بعد عورت اپنی بے نصیبی کا نقشہ کن حسرتناک الفاظ میں دکھاتی ہے تاکہ شوہر دونوں کی حالتوں کو لطف اور بے لطفی کے دونوں پلڑوں میں تول کے عدل سے اعتدال قائم کر سکے، وہ کہتی ہے ؎

مجھکو ہے غم تو پھر سنگار کون کرے تمھیں کہو
دیکھ کے حسن مجھکو پیار کون کرے تمھیں کہو

شوہر کے فراق پر سنگار کو تج بیٹھنا یہ اظہار محبت تو ہے ہی، مگر شعر اس سے بڑھکر پاکدامنی کی شہادت دے رہا ہے، یعنے سوا شوہر کے دنیا میں اس کے سنگار اور حسن کا کوئی دیکھنے والا نہیں "تمھیں کہو" کا لطف کوئی زباندانوں سے پوچھے۔ یہ ایسا سوال ہے، جس کا جواب اگر شوہر دے تو رحم، محبت، اور اظہار وفا کے سوا وہ اور کچھ دے ہی نہیں سکتا اور یہاں اخلاقی فلسفہ کا نتیجہ یہی نکلنا چاہیے۔

اب وہ زیور سے بیزار ہو کے مختلف زیوروں کا نام لیتے لیتے کس فصاحت سے کہتی ہے ؎

بار ہیں سیتے بالیاں، خار ہیں جو ہے دنتیاں
کس کو دکھاؤں اپنے کان اب میں ہیں کے انتیاں

"بار" اور "خار" کا تناسب الفاظ، اور وہ دونوں زیور جو قافیے میں آئے ہیں، ان کی لطافت قافیے کی صورت میں، یہ شاعرانہ لطافتیں سخن فہموں کو وجد میں لاتی ہیں۔

اسی زیور کے سلسلے میں پھر کہتی ہے ؎

دیتی ہے داغ آرسی، میں نہ چھوؤنگی اب اسے
آتی ہے زرد رو نظر، دیکھتی ہوں میں جب اسے

آرسی کے شیشے کو داغ سے جو مشابہت ہے وہ تو ہے ہی، دوسرے مصرعے کی بلاغت اور اس کے مضمون کی لطافت حضرت شوق کی شاعری کو انتہائے کمال پر ثابت کیے ہوئے ہے۔ زرد رو نظر آنے سے چہرہ کی زرد رنگت کا اظہار کس نازکخیالی سے کیا گیا ہے کہ سبحان اللہ۔

وہ چند اشعار کے بعد ایک ایسا حسرت کا سین دکھاتی ہے، جسکا خیالی نظارہ اگر کسی دل کو اپنے اثر سے مغلوب نہ کر سکے تو اس دل پر انسان کے دل کا اطلاق مشکل ہے، کہتی ہے ؎

میری خوشی کی زندگی عقد سے پیشتر رہی
ساتھ تمھارا کیا ہوا، چھوٹ کے تم سے مر رہی

یہ شعر اپنے عمدہ مذاق سے ہمارے ملک کی باوفا اور باعصمت عورتوں کی زندگی کا پورا فلسفہ ہے۔ عقد سے پیشتر وہ اپنے ماں باپ کے گھر جس خوشی سے زندگی بسر کر چکی تھی، اسکو اب حسرت کے ساتھ یاد کر رہی ہے۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ عقد کے بعد عورت کی ایک دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اب اس شعر کو آگے رکھ کے اگر دونوں زندگیوں کی حالتیں دکھائی جائیں تو اخلاق اور طرز معاشرت کے فلسفیانہ مذاق کی ایک بڑی

خطاب تیار ہو جائے۔ حضرت شوق نے کمال سخن سنجی سے یہاں کو ...... تین بجھوڑ دیا
اس کو اعجاز سخن بنا دیا ہے۔

عورت جوش محبت کے ساتھ اپنے جذب کا اظہار کس لطف سے کرتی ہو اسکے
خیال میں قوت جاذبہ کمی کر رہی ہے اسکی ذیل اُبھارتی ہے ؎

کاہ رُبا سے کہ اس کو کھینچتی ہوں خود بخود ۔ جذب کو نیچا دکھاتی ہوں زور کشش دیا دیا
اب بھی نہ یہ کشش کرے تو لے کوئی کیا کرے ۔ جذب کا نام جذب ہی پھر تو رہے خدا کرے

ان دونوں اشعار میں جس شکل سے جذب کو شہ دیگئی ہے اسکی نازک خیالی اور بلند پایہ شاعری
کی داد دل سے بے ساختہ ہونٹھوں پر آکے باہر نکلی پڑتی ہے۔

وفا اور محبت کا جوش ظاہر کرتے کرتے دل شکستہ عورت کو وہم ہوا کہ شاید شوہر کو
یقین نہ آئے، تو وہ اپنی تحریر کو جھوٹھ سے پاک ثابت کرنے کے لئے کیسا دردانگیز خیال اور
کیسی محبت خیز سزا اپنے واسطے پیش کرتی ہے ؎

جھوٹھ جو میں ذرا لکھوں تو ہو خفا مرا خدا
چاہ کو مجھ سے چھین لے یہ ہے سزا خدا

کہنے تو کہہ گئی مگر فوراً اس کو تنبہ ہوا کہ اگرچہ وہ سچی ہے، لیکن چاہ جو اسکے جذبات کی چیز
ہے اور جن جذبات کو وہ خود بہت عزیز رکھتی ہے، اس کا نام ایسے موقع پر کیوں لیا۔
اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی زبان بدلی اور کہہ اُٹھی ؎

توبہ یہ کیا میں بک اٹھی توبہ یہ کیا میں کہہ گئی چاہ۔ تمھاری جب چھنی پھر تو میں کچھ نہ رہ گئی

اس سے زیادہ حیا کی قدر اور کیا ہو سکتی ہے۔ مصرع دوم کا آخری حصہ "پھر تو میں کچھ نہ رہ گئی" کے الفاظ سے بول چال کی لطافت اور محاورے کی نفاست کو کس بلند پایے اور کیسے دلاویز پیرائے کے ساتھ ظاہر کر رہا ہے ؎

آگے چل کر وہ اپنے رونے پر کس لطف سے پردہ ڈالتی ہے ؎

آنچل اگر ہو تر تو میں خشک کروں نچوڑ کر
ساس کے پاس جاؤں تو منھ کو اُدھر سے موڑ کر

اس شعر کی خوبیوں نے دل کو جسقدر مسرور دیا ہے اسکی شرح قلم سے مشکل ہے۔ انسان کی ادا کا ایسا سچا اور صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے، جس سے بہتر کوئی دوسرا نقشہ ہو نہیں سکتا۔ ساس سے روتی ہوئی صورت ایسے عمدہ پیرائے میں چھپائی گئی ہے کہ میں بلند آواز سے حضرت شوق کو اُنکے مذاق سخن اور کمال فن کی داد دیتا ہوں۔ نظم میں ایسی سہل ممتنع نقاشی اُنھیں کا حق ہے۔

ہم سن عورتیں اس سے ملنے کو آتی ہیں، تو وہ اُنکو غمزدہ صورت کس دردانگیز حالت کے ساتھ دکھاتی ہے، اور کس ضبط سے کام لیتی ہے ؎

آتی ہیں ہمسنیں، مگر مجھ میں نہیں ہنسی مری — شرم سے کیا کہوں کہ "وہ" لیگئے دل لگی مری
میں نہ کہوں زباں سے کچھ کھلتا ہے درد رنگ سے — دیکھتی ہیں وہ غم کی شکل چہرے کے زرد رنگ سے
پوچھتی ہیں تو کیا کہوں چھیڑتی ہیں تو کیا کروں — سادہ کے چپ لہو کے گھونٹ بیٹھی ہوئی پیا کروں

"وہ" کا اشارہ، اے سبحان اللہ، زبان ہے کہ نظم کے رشتے میں موتی پرو رہی ہے؟ بیان ہے

کہ واقعات کے ساتھ فطری حالتوں اور اداؤں کی سچی نقاشی کر رہا ہے، دوسرے شعر نے خاموشی کی حالت میں جس رنگ سے درد کا اظہار کیا ہے، اور تیسرے شعر نے سکوت اور ضبط کی جیسی ہیئت دکھائی ہے یہ دلچسپیاں نگاہوں سے دلوں پر قبضہ کر رہی ہیں۔

فطرت کا مقتضا یہ ہے کہ اضطراب کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی خیال تسکین دینے والا بھی پیدا ہو، ایسا نہ ہو تو غیر تناہی سلسلہ انتشار اور صدموں کو بڑھاتے بڑھاتے دماغ کو مختل کر کے انسان کی حیات کا خاتمہ کر دے۔ فرقت نصیب عورت نے تسکین کی ایک صورت شوہر کی تصویر سے پائی، اور دوسری صورت چکور سے، جسے اُس کا شوہر پال کے چھوڑ گیا تھا، چکور کا نظارہ کس لطف سے شوہر کی یاد کا محرک ہے، کہتی ہے ؎

پال گئے ہو تم چکور ہوتی ہوں اس سے شاد میں
لیکے اسی کو گود میں کرتی ہوں تم کو یاد میں

لیکن چکور کی فطرت جو شب کو اسے چاند کی طرف متوجہ کرتی ہے، اس کا نظارہ عورت کی زبان سے کیسا حسرت انگیز واقعہ پیش کرتا ہے، وہ شوہر کو لکھتی ہے ؎

چاندنی رات میں مگر دیتے ہو غم ضرور تم
اسکی نظر میں چاند ہے، میری نظر سے دور تم

یہ حسرت کا سین جسقدر دلچسپ ہے، اس سے زیادہ شاعر کی تخیل قابل تعریف ہے کہ زمین کے خیال کو طبیعت کی بلندی سے آسمان پر پہنچا کے چھوڑا۔

چند اشعار کے بعد عورت باوجود بے خطا ہونے کے اپنی خطا کا ذکر کس لطیف

پیرائے میں کرتی ہے اور کیسے دلاویز طریقے سے شوہر کے دل کو گھر کی طرف کھینچتی ہے۔
حجاب جو شریف عورت کی طرزِ معاشرت میں اس وقت لازمی ہے جب شوہر کنبے کی
موجودگی میں گھر کے اندر قدم رکھے، ادا تو اسی حجاب کی بیان کی گئی ہے، لیکن طرز
اور دلکش آواز کے ساتھ۔ اس طرز کا حسنِ بیان نگاہ اور دل دونوں کے ساتھ جادو
کام کر رہا ہے۔ وہ کہتی ہے سے

کی نہیں میں نے کچھ خطا کی ہو تو بھول جاؤ تم مجھ کو نہ دیکھنا، مگر، خیر سے گھر کو آؤ تم
آؤ جو تم رخ پہ میں آنچل اٹھا کے ڈال لوں اسمیں تو حرج کچھ نہیں جھانک کے دیکھ بھال لوں

کیا اس سے بہتر اور دلفریب ادا اسوا حضرت شوق قدوائی کے اور کسی شاعر نے اردو
فارسی میں دکھائی ہے؟ نہیں۔ یہ قدرت سخن پر انھیں کی زبان کو حاصل ہے کہ حجاب ا
اسکے ساتھ جھانک کے دیکھنے کا خوشنما منظر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا جسکے لطف
دل کبھی آسودہ نہیں ہو سکتا۔ "خیر سے" کہہ کے عورت کی زبان نے محاورے کے جسم میں
تازہ جان ڈال دی ہے۔

عورت خط لکھ رہی تھی کہ ابر آ گیا، مور بول اٹھا پپیہے انار کے پیڑ پر آ بیٹھے۔ یہ سین
جس نفاست سے دکھایا گیا ہے اس کی تعریف کہاں تک کی جائے، وہ کس حسرت کے
ساتھ کہہ رہی ہے سے

ابر امنڈ کے آ گیا روؤں گی اسکے ساتھ میں اپنے جگر کے خون سے دھوؤنگی خط کے ہاتھ میں
بول اٹھا وہ میر امور ہاتھ سے اب تو دل گیا مجھکو نہ مل سکو گے تم، اسکو تو ابر مل گیا

گھر میں ہو پیڑ اندر کا اسبہ پپیہے آتے ہیں　　دیکھئے میری ہکیسی مجھ پہ ترس وہ کھاتے ہیں
وہ نہیں مینہ کبھی پیڑ کے اوپر آکے چپ　　تم کو پکارتے ہیں، روز شرم سے مجھکو پاکے چپ

تیسرے شعر کا دوسرا مصرع غضب کا حسرت انگیز فوٹو ہے، پپیہوں کا پیڑ میں کھانا اور پھر جواب عورت جو دل کے جذبات کو شوہر کے نام سے زبان پر نہیں لاسکتی اسکی خاطر سے پکارنا یعنے "پی کہاں" کی آواز نکالنا، ان اداؤں کا اظہار ایسی فصاحت اور لطافت کے ساتھ یہ شاعری کیا ہے، سحر بیانی ہے۔

طرز معاشرت سے ہمارے ملک کی عورتیں جس حالت میں ہیں، اسکی پوری داستان صرف یہ ایک مصرع کہہ رہا ہے۔ ۶ عورت اگر میں ہو پڑی اس میں مری خطا نہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ ہے تو ایک ہی مصرع، مگر ایک ہزار اشعار بھی لکھے جائیں تو شاید اسکی شرح نہ ہو سکے "ہو پڑی" کا محاورہ زبان کیا، دل سے داد لے رہا ہے۔

درد انگیز خط کو لکھتے لکھتے عورت کا نازک دل ضبط کی طاقت کھو بیٹھا، اور اسکے آنسو بے ساختہ ٹپک پڑے، وہ اس حالت کو کس مجبوری مگر کس خوبی کے ساتھ ظاہر کرتی ہے ؎

اشک مرے ٹپک پڑے خط ہوا تر میں کیا کروں　　بھیگ کے کچھ بگڑ گئے، حرف، مگر میں کیا کروں
بندھ گیا آنسوؤں کا تار خوش ہو میں دیکھکر جسے　　بنگیا موتیوں کا ہار پہنے تمھاری یاد اسے

دوسرے شعر کی شاعرانہ نازک خیالی حضرت شوق کی کمال معنی آفرینی کی قطعی دلیل ہے۔ یاد کو ہار پہنانا، اس کا مزہ سخن فہموں کے دلوں سے پوچھنا چاہئے۔ "میں کیا کروں" کی ردیف محاورے کی لطافت کے ساتھ مجبوری کی سچی اور دلچسپ تصویر ہے۔

آخر عورت حسرت اور یاس سے مجبور ہو کے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو رہی ہے، اور کس درد آواز سے کہتی ہے ؎

صبر سے گذری موت پڑا تو جگر کروں گی میں — اپنے بدن کی آگ سے آپ ہی جل مروں گی میں
مجھکو یقین ہے کہ تم آکے مجھے نہ پاؤ گے — آکے نہ پاؤ گے تو کیا، میری لحد پہ آؤ گے؟
فاتحہ بھی پڑھو گے تم، ہاتھ اُٹھا کے یا نہیں — روح کو خوش کرو گے تم پھول چڑھا کے یا نہیں
سبزے کو دیکھنا ضرور مجھ پہ وہ بار ہو نہ جائے — نرم رہے، ہرا رہے، سوکھ کے خار ہو نہ جائے

پہلے شعر کا دوسرا مصرع ہجر کی تپ کا جو درد انگیز نتیجہ نکال رہا ہے، اسکی لطافت اور اسکے بیان کی فصاحت لاجواب ہے۔ بیچ کے دو شعر حسرت کی کیسی دردناک تصویر کھینچ رہے ہیں، اور جو اس نظم کے خاتمہ کا شعر ہے، اس پاکیزہ شعر کو قادر سخن شاعر نے لکھکے قلم ہی توڑ دیا

اس نظم کی داد جو کچھ میں نے دی، یہ اگرچہ اُس تخیل کی پوری داد نہیں ہے، جس کے موجد اردو زبان کی دنیا میں منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی ہوے ہیں۔ البتہ نظم کے فطری خیالات اور دل کے اصلی جذبات کا صحیح اندازہ میرے اس ریویو سے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے انگریزی نظموں کو دیکھا ہے، وہ انسان کے فطری جذبات اور عام طور پر نیچر کے مناظر کی قدر ضرور ان لوگوں سے زیادہ کر سکتے ہیں، جنکی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچی ہیں اور جن کے دماغ نیچر کی فلاسفی سے ناآشنا ہیں۔ انگریزی میں ایسے سلسلے کے ساتھ اسقدر انسانی جذبات اور فطری حالات سے بھری ہوئی نظم یقیناً نہ ملے گی۔ اسکے جہاں اور اسباب ہوں، وہاں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ایشیا کی شوہر پرست، عفت مآب،

اور باوفا عورتوں کا مذاق زندگی جسقدر پاکیزہ ہے اسکی مثال اور کسی ملک میں نہیں مل سکتی
بعض نافہم جو نیچر کے فلسفہ سے ناواقف ہیں اور جنکی نگاہیں علوم کی منزلوں کو طے
کرکے حیات انسانی کے دلی جذبات اور فطری واقعات تک نہیں پہنچی ہیں، وہ اس قسم کی
نظموں کے نازک خیالات اور لطیف معاملات کے سمجھنے ہی سے مجبور رہوں تو کیا تعجب ہے
انکی مثال ایسے لوگوں سے دینی چاہیے جو بغیر بصارت کے دنیا میں پیدا ہوے۔ وہ تو نہ
دنیا کو دیکھ سکتے ہیں نہ جان سکتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔

کوئی انسان، مرد ہو یا عورت، دلی جذبات سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے
کہ سوسائٹی کا اثر کہیں اس کو ایک رنگ میں ظاہر کردے۔ اور کہیں دوسرے رنگ میں
ہندوستان کی پاکباز عورت جس کا راز اور جس کے دلی جذبات سے واقف ہونیوالا
سوا اس کے شوہر کے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا، وہ اگر شوہر سے بھی جذبات کا اظہار نہ
کرے تو یقیناً اس کا دم گھٹ جاے، اور اسکی زندگی کو تپ دق ختم کردے۔

میں نے منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کی سب نیچرل نظمیں دیکھی ہیں۔ میں
بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح وہ قدرت سخن سرائی سے فطری اداؤں کے
دکھانے اور جذبات انسانی کے سچے نقشے کھینچنے پر اعلیٰ درجہ کی زبان کے ساتھ قادر ہیں
اسی طرح وہ سائنس اور فلاسفی کے اہم مسائل کو سلیس اور فصیح زبان میں نظم کرنے پر
بھی قادر ہیں۔ ان دونوں اصناف سخن کے موجد اُردو زبان میں وہی ہوے، اور
شاعری کے خزانے میں جو گراں بہا جواہر وہ بھر رہے ہیں، ان کے اعتبار سے سخن سنجی کی

تاریخ میں انکا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ ان دو اصناف سخن کے علاوہ انہوں نے بہار اور برسات کی نظموں میں جو لطف سبزی کا دکھایا ہے یا اور مختلف اقسام کی نیچرل نظموں میں اسی نظم کے مناسب جو لطافتیں ظاہر کی ہیں اُن سبھوں کی مجموعی حالت خود بلند آواز سے کہہ رہی ہے کہ وہ قادر الکلام ہیں؛ اور صرف معمولی قادر الکلام نہیں بلکہ فلاسفر اور سحر البیان قادر الکلام۔

میں اپنے معزز دوست مسٹر قدوائی بیرسٹر ایٹ لا سے متفق ہوں کہ عوام نے اُردو میں نیچرل مضامین کی بہت کچھ مٹی خراب کی ہے۔ آج بھی بکثرت ایسی نظمیں نظر آتی ہیں جو شاعری کو بدنام کر رہی ہیں۔ اردو شاعری کا نصیب پھر بھی اچھا ہے کہ آخر وہ حضرت شوق، قدوائی کا سا بلند پایہ شاعر نیچرل نظموں کے لیے پا ہی گئی ورنہ خدا جانے فطرت کی مٹی کب تک خراب ہوتی۔

اب میں اس ریویو کو ختم کرتا ہوں اور ظاہر کیے دیتا ہوں کہ اگرچہ تمام نظم فصیح زبان لطیف خیالات اور حیات انسانی کے فطری جذبات سے بھری ہوئی ہے، لیکن میں زیادہ طوالت کے خیال سے صرف چند اشعار ہی پر ریویو کر سکا۔ اس سے پورا نہیں تو ایک حد تک اس اردو نظم کی بلند شاعری اور فطرت انسانی کی پراثر کششوں کا اندازہ مل جائے گا۔

محمد سلیمان، بیرسٹر ایٹ لا

تیسرا رخ

شوہر نے عورت کے خط کا جواب لکھا ہے

تمہارے خط کو دیکھ کر نظر اسی میں گھر گئی
تمہاری شکل خط کے ساتھ پتلیوں میں پھر گئی

ہے لفظ لفظ خط کا درد و غم کی داستان سے
قلم تمہارا دل بنا وہ بول اٹھا زبان سے

تمہارے سب گلے بجا، تڑپ بجا، الم بجا
تمہاری سب شکایتیں تمہارا ہی ستم بجا

وہاں جو دل میں درد ہے یہاں بھی آہ سرد ہے
وہاں جو رنگ زرد ہے یہاں بھی رخ پہ گرد ہے

اُدھر بھی چوٹ اِدھر بھی ہے نہ تاب ہے اُدھر
نہ چین اُدھر نہ چین ہے اِدھر نہ خواب اِدھر

اُدھر وصل کے غم میں کٹے اِدھر تڑپ کے شب کٹے
یہ سوچ شام ہی سے ہو کہ دیکھیں رات کب کٹے

تمہارا چین میں ہی تھا جو دور ہوں تو دور ہو
سرور میرے دم سے تھا جو میں نہیں تو اب سرور دور ہو

میری خوشی تمہیں سے تھی نہ تم رہے تو اب خوشی کہاں
فراق تمہیں لے گیا رلا کے سب خوشی مری

وہ دن خیال ہو گئے وہ راتیں خواب ہو گئیں
وہ دو دلوں کی دھڑکنیں سب اضطراب ہو گئیں

نہ ان لبوں پہ وہ ہنسی نہ چہرہ پہ وہ رنگ ہے
نہ روح میں وہ تازگی نہ دل میں وہ امنگ ہے

شباب لٹ گئے حسن انکی صورتیں بگڑ گئیں — گھروں میں لوٹ پڑ گئی تو بستیاں اُجڑ گئیں

جہان کوئی دوسرا جو غم سے پاک ہو کہیں — تو ہم تم اس جہان سے نکل چلیں رہیں وہیں

یہاں ہزار آفتیں انھیں میں دل گھرا کریں — یہاں ہزار گردشیں انھیں میں سر پھرا کریں

وہ ملک چل کے ڈھونڈھ لیں جہاں نہ آسمان ہو — جہاں نہ اسکے ظلم سے مصیبتوں میں جان ہو

جہاں نہ ہو اجل کہ "اس کو" اس کا داغ دے سکے — جہاں زمین ہی نہ ہو کہ گور منہ میں لے سکے

جہاں نہ کوئی فکر ہو نہ بھوک ہو نہ پیاس ہو — جہاں نہ میں اداس ہوں جہاں نہ تم اداس ہو

تمھارے آنسوؤں کے داغ خط میں جگہ جگہ پڑے — وہ خط سے میرے دل میں آ کے داغ بنکے رہ پڑے

تمھاری عمر ہو دراز اجل کا نام چھوڑ دو — لحد کے منہ میں خاک منہ سے یہ کلام چھوڑ دو

ہوا لحد کے سبزے کی بھرے نہ پھر دماغ میں — ہے سبزہ تم ہو اور ہرا تمھارے خانہ باغ میں

نہ تم ہو بھولنے کی شے نہ تم ہو چھوٹنے کی شے — قسم خدا کی تم ہو دل میں اور دل بغل میں ہے

نظر میں کھب کے نور بن گئے کہ تم مری نظر میں ہو — جمال بنکے دل میں ہو خیال بنکے سر میں ہو

تمھاری مسکراہٹوں کو یاد کر رہا ہوں میں — کھلیں نہ دانت اس ادا پہ صاد کر رہا ہوں میں

وہ لب وہ انکی جنبشیں مری نظر کو یاد ہیں — وہ ہلکی ہلکی چٹکیاں مرے جگر کو یاد ہیں

وہ ترچھی ترچھی چتونیں ستم کریں پھریں جدھر — وہ کالی کالی پتلیاں کبھی ادھر کبھی ادھر

وہ بال کھول کر کبھی چھپرکھٹ کے سر کو تھامنا — لچک پڑے بدن تو پھر لپک کے در کو تھامنا

لبوں کو اپنے پونچھنا وہ آرسی کو دیکھ کر — نہ پھیل جائے تاکہ رنگ پان کا ادھر ادھر

وہ نازکی کہ تم نے کہہ کے یہ اتاری آرسی — گراں ہے میرے ہاتھ پر جڑاؤ بھاری آرسی

وہ ناپسند ہونگی کی بھنویں چڑھا کے پھیرنا — وہ میری سمت پھر نظر کہ مسکرا کے پھیرنا

گلوریوں کی صورتیں وہ خوشنما نئی نئی — سپید پان اوپر اور اندر اس کے پستئی

وہ سادگی تمھاری بانکپن کو شہ دیئے ہوئے — وہ شوخیاں حیا کو اپنی گود میں لیے ہوئے

سحر کے وقت پھینکنا گلے سے ہار اُتار کے — بچھونے سے وہ جھاڑنا گرے جو پھول ہار کے

وہ ہار مجھکو یاد ہے، کہا تھا دیکھکر جسے — ہیں موگرے کے پھول کم نہیں پہنتی ہیں اسے

کہ سخت بو ہے سر میں درد ہوگا، دور ڈال دو — نہیں تو کامنی کے پھول چُن کے تم نکال دو

پلنگ اپنا کھینچکر وہ چاندنی میں لیٹنا — ہوا سحر کی سرد ہو تو جسم کو سمیٹنا

زری کو جب سے وہ چڑھ کہ چبھتی ہے یہ خار سی — پسند صرف ململ اور گلبدن بنارسی

وہ چوڑیوں کا پھیرنا، کہا تھا دیکھکر جنھیں — چبھیں گے ان کے گوکھرو نہ پہنوں گی کبھی انہیں

کہو بدل کے لائیں ایسی چوڑیاں بڑے میاں — کہ تین تین بانکیں، چار چار ہوں کریلیاں

گرا زمرد ایک شب جو ٹوٹ کر بلاق سے — تم اسکو ڈھونڈنے لگیں چراغ لیکے طاق سے

تمھیں تو وہ نہیں ملا، مگر میں اُس کو پا گیا — دیا تو پھر تمھیں مگر میں اُس گھڑی چھپا گیا

مری ہنسی پہ وہ تمھارا پیچ و تاب یاد ہے — وہ تیوریاں چڑھی ہوئی، وہ اضطراب یاد ہے

غرض، خدا سے ہے دعا کہ تم ہو اور جہان ہو — تمھیں تو میری روح ہو تمھیں تو میری جان ہو

تمھارا زیور اور آئے میرے پاس ڈاک پر — لگایا تیر طنز کا یہ تم نے دل کو تاک کر

تمھاری بدظنی بجا، مگر غلط، مگر غلط — یہ آنکھیں بے وفا نہیں تو پڑتی کیوں نظر غلط

نظر میں تم جگر میں تم، تو کون دخل پا سکے — مکان سب گھرے ہوئے ہیں کون اُس میں آ سکے

قسم تمھارے گیسوؤں کی جنکے پیچ میں ہے دل
قسم تمھارے صاف رخ کی جسپہ ہے سیاہ تل

قسم تمھاری پتلیوں کی جن کی ہر نظر بلا
قسم تمھارے ابروؤں کی جنکے بس میں کربلا

قسم تمھارے اُن لبوں کی جنکا رنگ لال ہے
قسم تمھارے گھونگھروؤں کی جنکے پاس جال ہے

قسم تمھارے سر کی جسکے بال ہیں بڑے بڑے
قسم نظر کی سحر جس سے پائے زک اگر اڑے

قسم تمھارے نکی آنچ میں بار ہا بچھڑا ہیں من
قسم تمھارے وسوسوں کی جنمیں اب گھرا ہوں میں

قسم تمھارے اس سخن کی طرز جس کا کام ہے
قسم تمھاری اس چھری کی ناز جسکا نام ہے

قسم تمھاری اس ہنسی کی جس سے گل کھلا کرے
قسم تمھاری اس زبان کی مجھسے جو گلا کرے

قسم تمھارے اس غضب کی سرخ جس سے گال ہو
قسم تمھاری اس حنا کی ہاتھ جس سے لال ہو

قسم شکن کی جب جبیں پہ ناز اسکو ڈال دے
قسم صدا کی بات کو جب اٹھ کے ساتھ ٹال دے

قسم گلے کی جس سے زیب موتیوں کے ہار کو
قسم دہن کی جسکے دانت دیں شکست انار کو

قسم ہے انگلیوں کی دلکو چھین لیں وہ جب ہلیں
قسم ہے رخ کے سائے کی رہیں پہ جس سے گل کھلیں

قسم ہے بے رخی کی جسکو پھیر کے رخ عیاں کرے
قسم ہے خامشی کی جب نگاہ کچھ بیاں کرے

قسم ہے تن کی قد آدم آئینہ جیسے کہوں
قسم ہے قد کی جسکا سایہ بن کے کاش میں رہوں

قسم تمھاری چال کی ہے جسکے ساتھ حشر ہے
قسم قدم کی جنبشوں کی جنکے ساتھ نشر ہے

غرض تمھارے حسن کی قسم یقین مان لو
مرے جگر میں اور دل میں ہو تمھیں یہ جان لو

جہاں میں آکے پڑ گیا تجارتوں کے پھیر میں
جب الجھنیں گتھیاں پڑیں تو سلجھیں جاکے دیر میں

چھوڑ دیا ہے آسرا نہ توڑو دل کو یاس سے
نہ تم امید کو ہٹاؤ اپنے دل کے پاس سے

گلے نہ پھر گلے رہیں گے مجھکو ہونگے ایک دن — ہنسی خوشی گزرے سب گلے لبوں پہ آ کے ایک دن

میں خط میں جتنا بھیج دوں جو تم بھی پڑھ سکے — نظر تو پا ہی جائے گی مگر جو دل بھی پا سکے

یہ خط ہے میرے ہاتھ کا اسی کو چین جان لو — میں بیسویں دن آؤں گا یقین اسکا مان لو

میں اس خبر سے خوش ہوا کہ زندہ ہے جگر ابھی — تمھارے پاس ہے تمھارا وہ حسین مور ابھی -

پپیہے خوش ہوئے کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں — جواب میں وہ پی کہاں تو تم کہو کہ آتے ہیں

یہ خط تو ختم ہو چکا پیام اب ہے شوق کا

دعائیں اب ہیں شوق کی سلام اب ہے شوق کا

تیسرے رخ پہ ایک نظر

اردو اور فارسی کی زبان جو شاعری کے لیے بہت موزوں اور شیریں تسلیم کر لی گئی ہے، اس میں بھی عورت اور مرد کے سچے جذبات کے ساتھ فطرت کے صحیح اور اکات اور انسانی دل و دماغ کے اصلی خیالات کی نظم کا وجود نہیں ہے فطری نقاشی کا مذاق سخن سرایان فارس میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ برسات، بہار، خزاں، اور جنگل وغیرہ پر جتنی نظمیں شعرائے ایران کی ہیں، ان میں سوا لفاظیوں اور ادعائے مبند پردازیوں کے فطرت کی کارسازیوں اور قدرت کی خوبیوں کے نظارے کا ذکر کہیں خال خال ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر نے فطرت کو پیش نظر رکھ کر نظم نہیں کہی بلکہ جہاں اور مختلف خیالات کے اشعار قلم سے نکلے وہاں دو ایک شعر ایسے بھی نکل گئے جن میں فطرت کا رنگ اتفاقی آپڑا۔

اردو شاعری نے ابتدا ہی سے فارسی شاعری کی تقلید کا جامہ پہن لیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو انھیں لوگوں کی پیدا کی ہوی ہے جنکے دماغوں میں فارسی شاعری بھری ہوی تھی سنسکرت اور بھاشا اس زمانہ میں ٹھنڈی ہو گئی تھیں، اور اہل فارس کی

کثرت آمدورفت اور شعراء فارس کے ہجوم سے ہندوستان ملک ایران کا ایک حصہ ہو رہا تھا خود ہندوستان کے اصلی باشندے، اپنی اپنی زبانوں کی شاعری چھوڑ کر فارسی کی جانب ٹوٹ پڑے تھے۔ ایسی سوسائٹی کے اثر سے یہ بات لازمی تھی کہ اردو شاعری میں جوگرمی پیدا ہو وہ فارسی کے شعلوں سے پیدا ہو اور ایسا ہی ہوا۔

فارسی شاعری کے تخم سے اردو شاعری پیدا ہوئی، تو سائنس کے قانون وراثت نے اپنا زور دکھایا، اور اردو نے فارسی کی صورتیں لے کر بڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ فرع اپنی اصل سے بالکل مشابہ ہو گئی۔ سائنس کے قانون تباین کا اثر صرف اسقدر ہوا کہ زبان میں ہندی کی آمیزش سے فارسی کے ساتھ اختلاف ہو گیا۔

بہرحال اردو کی شاعری فارسی کی پیدا کی ہوئی اور پروردہ ہے۔ اس میں فطری مذاق کہاں سے آتا۔ یہ بھی اپنے دامنوں کو سمیٹے ہوئے اسی احاطے میں بیٹھ گئی، جو احاطہ اس کی مادرِ مہرباں نے کھینچا تھا۔

ایک مدت تک غزل، واسوخت، مثنوی اور قصائد وغیرہ اسی قسم کی نظموں سے اردو کی سخن سنجی کا خزانہ معمور ہوتا رہا، اور نثر میں فسانۂ عجائب اور سرورِ سخن کی سی کتابوں نے بلند نامی کے جھنڈے اڑائے۔ آخر سوسائٹی کے مذاق میں کچھ تغیر ہوا، اور زمانے میں حضرت آتش، حضرت غالب، اور حضرت انیس کے سے سخن سرا پیدا ہوئے۔ آتش نے غزل میں جذبات، غالب نے جذبات نظم کے ساتھ نثر میں سلاست اور انیس نے فطری نقاشی کی خوبیاں پیدا کیں۔ ان بزرگوں کے نام شاعری کی تاریخوں میں آبِ زر سے لکھے گئے

لیکن ان کے دماغوں اور قلموں سے جو نظمیں نکلیں، وہ صرف ایک ہی صنف کو لیے ہوئے
تھیں۔ مثلاً آتش اور غالب صرف تغزل کے عمدہ نوا سنج، اور اسی صنف میں جدت آفرینی
کے ساتھ لطیف ہوئے، اور انیس نے مرثیہ اور سلام کو اختیار کیا، وہ صرف اسی صنف میں انتہا
کمال تک گئے۔ ان کے کھینچے ہوئے فطری نقشے دلچسپ دلکش اور دل فریب ہیں لیکن وہ
انھیں حدود تک محدود ہیں، جو حمد و مرثیہ اور سلام کے لیے ناظم اور موزوں تھیں۔ اس میں
شک نہیں کہ جو تصویریں انیس مرحوم کے قلم سحر رقم نے دکھائی ہیں، وہ لاجواب ہیں۔ زبان
ان کے قابو میں اور فصاحت ان کے قبضے میں تھی۔ مگر میرا مطلب یہ ہے، کہ فطرت کی عام
جلوہ آرائیاں اور قدرت کی وسیع کارسازیوں کی جانب ان کو توجہ نہیں ہوئی۔ توجہ
نہ ہونے کے کچھ ہی اسباب ہوں مجھے ان سے بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بات لکھنی ہے
کہ جو مذاق علمی اور عملی صورتوں کے ساتھ آج نظموں اور نثروں میں نظر آرہا ہے، یہ
انگریزی علم ادب سے اردو میں آیا، اور یہ مشرق کی سرزمین سخن میں مغرب کی تخم
افشانیوں کے ثمرے ہیں۔

جدید مغربی مذاق کے پھیلتے ہی ہندوستان میں نیچرل شاعری کا وہ طوفان اٹھا
جس کی انتہا نہ رہی۔ دنیائے شاعری میں نوخیز اور نوآموز لڑکے، جن کی زبانیں اور جن کے
قلم صحیح رفتار سے ناآشنا تھے، اپنے لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے
قدموں سے چل کھڑے ہوئے۔ اس طوفان بے تمیزی نے سخن سنجی کے صاف راستوں کو
برباد کر دیا۔ اب تک ہم دیکھ رہے ہیں کہ ناواقفان سخن اپنی ناسمجھی کے ساتھ سخن سرائی کے

مدعی ہیں۔ نہ وہ شتر گربہ کو جانیں، نہ تعقید کو، نہ شائیگاں کو، نہ اور کسی نقص کو، ان کے خیال خام میں سخن سنجی کے واسطے پختہ مغزی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ نافہمی کے ہجوم سے دماغ میں اس خیال کو لا ہی نہیں سکتے کہ دنیا کا کوئی علم اور کوئی فن اصول سے متجاوز ہو کے کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے لوگوں کی نظمیں سوا اس کے کہ ارباب فہم کے دماغوں کو پراگندہ اور نگاہوں کو پریشان کریں، کوئی دوسرا نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ وہ قلمرو سخن میں ٹکسال باہر ہیں۔

یہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا، برپا ہے، اور غالباً ابھی برپا رہے گا۔ لیکن اس افسوس کے ساتھ ہی کچھ اسباب اطمینان کے بھی مہیا ہو گئے ہیں یعنی اقلیم سخن نے حضرت سحر البیان شوق قدوائی کے سے قادر الکلام سخنور کو پیدا کر دیا جن کے پرزور دماغ نے سائنس اور فلسفہ کے اہم مسائل کو فصیح اور سلیس اردو میں با اصول نظم کر کے یہ بات ثابت کر دی کہ اگر زباں دانی کے ساتھ کلام پر قدرت کاملہ ہو، تو زبان اردو سخن پیرائی کی ہر صنف کو نہایت زور اور لطافت کے ساتھ اپنی گود میں جگہ دے سکتی ہے۔

علمی مسائل کے علاوہ حضرت شوق قدوائی نے جو سبزیاں دکھائی ہیں اور سبزۂ قدرت کے جیسے چمن صفحوں پر کھلائے ہیں، نیز انسان کے فطری جذبات، فطری خیالات اور فطری اداؤں کی جیسی سچی اور خوشنما تصویریں کھینچی ہیں ان کی مثال اگر آج ہندوستان کی اردو شاعری میں تلاش کی جائے تو سوا حضرت شوق قدوائی کی نظموں کے اور کہیں نہیں مل سکتی۔ ایسی حالت میں مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں ہے کہ حضرت شوق

قدوائی ملک سخن میں فی زمانہ خود ہی اپنی مثال ہیں، اور یہ قول ہندوستان کے مشہور ایڈیٹر حضرت حکیم برہم کا جو اخبار مشرق کے مالک ہیں بہت صحیح ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی اور حضرت شوق قدوائی کی نظم و نثر کی داد روح القدس سے ملتی ہے۔

"عالم خیال" کے پہلے نمبر پر ہندوستان کے جلیل القدر فاضل مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹر کا نہایت عمدہ ریویو نکل چکا ہے، جسکو دیکھکر میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ حضرت بیرسٹر کے سخن فہمانہ خیالات محققانہ اشارات اور حکیمانہ نکات نے اس نظم کے فلسفہ کی نہایت ہی فصیح بلیغ اور لطیف شرح کردی ہے۔ اگر حضرت بیرسٹر کے ادبیت قلم سے ریویو کی روشنی نہ پھیلتی تو نظم کی بلندی تک بعض کوتاہ بین نظر پہنچ بھی نہ سکتی، اور سلسلہ نظم کا قائم کرنا تو عموماً دشوار ہوتا۔

"عالم خیال" کے دوسرے رُخ پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا کا ریویو نکلا۔ وسیع الخیال اور قابل بیرسٹر نے جن لطافتوں اور نزاکتوں کی شرح کی ہے ان کو دیکھ کے نظم اور ناظم دونوں کو لاجواب اور یکتا کہنے میں ذرا بھی تامل کی وجہ نہیں ہے۔

انگریزی تعلیم اور یورپ کے نظارے سے فطری مذاق پر جیسی وسعت نگاہ کی ان دونوں فاضل محقق بیرسٹروں نے دکھائی ہے، معمولی مذاق کے آدمیوں سے یہ ممکن نہیں جیسا حق سخن حضرت مصنف نے ادا کیا، ویسا ہی حق شرح دونوں جلیل الشان فاضل بیرسٹر صاحبان نے،

علمی قلمرو کے دونوں رفیع القدر اہل قلم بالاتفاق اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ

انسانی جذبات اور فطری خیالات کی ایسی مسلسل نظمیں انگریزی میں بھی نہیں ہیں اور اس نئے طرز کے موجد اردو میں حضرت شوق قدوائی ہی ہوئے، جن کے کمال سخن اور نادر کلام علمی اور فطری نظموں سے ہندوستان کے سخن فہموں اور پاکیزہ خیالات رکھنے والے سخن سنجوں سے احسنت و آفریں کی آوازیں بلند کرا دیں۔

بقول نامور ادیب حضرت برہم کے اس زمانے میں یہ فخر ہمارے صوبۂ متحدہ ہی کو حاصل ہے کہ اس میں لسان العصر حضرت اکبر اور سحر البیان حضرت شوق قدوائی دو یکتاز سخن موجود ہیں۔

میں کہتا ہوں خدا ان دونوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ انھیں دونوں سے اس وقت ہندوستان کی اردو شاعری اصول علمی اور لطافت زبان کے ساتھ اوج کمال پر پہنچی ہوئی اپنے خوشنما جلوے دکھا رہی ہے۔

"عالم خیال" کے دو رخ اعلیٰ درجے کے قابل بیرسٹروں نے لیے۔ اب میں بحیثیت ایک وکیل کے نمبر سوم کا مدعی ہوں یعنی میں نے عالم خیال کے تیسرے رخ پر ریویو کے لیے قلم اٹھایا ہے۔

یہ نظم دوسرے رخ سے وست و بغل ہے یعنی شوہر کی جانب سے اس کی فرقت نصیب زوجہ کے خط کا جواب ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تمھارے خط کو دیکھ کر نظر اسی میں گھر گئی تمھاری شکل خط کے ساتھ پتلیوں میں پھر گئی

خط کو دیکھ کے جوش محبت سے نظر کا اس میں گھر جانا اور اس کے لکھنے والے کی شکل کا

پتلیوں میں پھر جانا؛ نہ اس سے زیادہ فطری جذبے کا اظہار ہو سکتا ہے، نہ اس سے زیادہ فصیح الفاظ میں خط اور پتلیاں ان دونوں کی محبتانہ کشش قلم سے پیدا ہو سکتی ہے شاعر نے لطفِ بیان کا خاتمہ کر دیا اور حرفوں سے محبت کی مجسم شکل دکھا دی۔ اس خط کے الفاظ سے کیا حالت نظر آئی؟ اس حالت کا مصور یہ دوسرا شعر ہے ؎

ہر نقطہ لفظ خط کا درد و غم کی داستاں ہے   قلم تمھارا دل بنا۔ بول اٹھا زباں سے

عورت کے دردِ فرقت کا اثر شوہر کے دل پر الفاظ سے بڑھ گیا وہ الفاظ کون ہیں؟ وہ ہیں جنکو قلم نے عورت کا دل بن کر اپنی زبان سے ادا کیا ہے۔ اس شعر کا دوسرا مصرع ترکیب کی خوبی اور زبان کی فصاحت کے ساتھ اس قدر بلاغت کو لیے ہوئے ہے اور اتنے وسیع مطالب کا گنجینہ ہے کہ اس کی پوری شرح کسی فرقت زدہ کا دل ہی کرے تو کرے قلم نہیں کر سکتا۔

عورت کی دردانگیز حالت کو سمجھ بوجھ کے شوہر کس خوبی سے عورت کی دلجوئی کا پہلو لیے ہوئے اس کے شکووں اور اس کی بےچینیوں کو تسلیم کر رہا ہے ؎

تمھارے سب گلے بجا۔ تڑپ بجا۔ الم بجا   تمھاری سب شکایتیں تمھاری ہی قسم بجا

اس قسم سے عورت کے دل پر یقین کا اثر حسن لطف سے ڈالا گیا ہے اسکو اہل فہم ہی سمجھ سکتے ہیں، اور محاورے کی نفاست نے زبان کا جو مزہ پیدا کیا ہے اس کو زبان دانوں کے دلوں سے پوچھیے۔

اظہار اضطراب کے بعد شوہر نے عورت کے اس بیان کا، جو عورت کے لکھے

ہوے خط میں ہے کہ وہ سٹرن کی طرح شل ٹل کے رات کاٹتی ہے اذیں کے شعر سے جواب دیا ہے ؎

اُدھر اُن کے شب کٹے اِدھر تڑپ کے شب کٹے ۔ یہ سوچ شام ہی سے ہے کہ دیکھیں رات کب کٹے

دوسرا مصرع کتنا پاکیزہ خیال لیے ہوئے ہے اور کس لطف سے اس فطری حالت کو ظاہر کر رہا ہے جو اضطراب کے وقت پیش آتی ہے اور جس کی لازمی صورت یہ ہے کہ انسان شام ہی سے بیقرار ہو ہو کے صبح کے جلد نمودار ہونے کی تمنا کرے۔ یہ طے شدہ کیفیت ہے کہ فرقت زدہ پر رات بھاری ہوتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ دن کو مختلف شکلوں کا قلق نہ خیالات کو کچھ نہ کچھ اِدھر اُدھر بھٹکاتے رہتا ہے اور رات کو سب خیالات سمٹے ہوئے مرکز فرقت کے ہجوم میں گھر جاتے ہیں۔

اس شعر کے بعد چار اشعار اس بات کو ظاہر کر رہے ہیں کہ "تمہارا چین میں تھا اور میری خوشی تم تھیں"۔ فراق سے دونوں کی راحتیں اضطراب ہو گئیں اب نہ وہ ہنسی ہے نہ وہ روح کی تازگی البتہ یہ نقشہ ہے ؎

شباب۔ رنگ۔ حسن انکی صورتیں بگڑ گئیں ۔ گھروں میں لوٹ پڑ گئی تو بستیاں اُجڑ گئیں

یہ شعر اظہار حالت کے ساتھ زبان کی پاکیزگی، بیان کی فصاحت اور مثال کی خوبی کو جس لطف سے دکھا رہا ہے یہ نفاستیں شاعر کی سحر البیانی کی نہایت پُر اثر تصویریں ہیں۔

فطرت انسانی کا یہ قاعدہ ہے کہ کثرت رنج کے مصائب کو جھیلتے جھیلتے اُسکے خیالات حسرت کے ساتھ اسباب آسائش کے جویا ہوتے ہیں۔ اسباب آسائش کی جستجو کے پانچ

مسلسل اشعار جو سحر البیان سخن سنج نے اس موقع پر کہے ہیں اور جن میں تخیل لطیف، کمال فن، فصاحت کلام اور جدت معنی آفرینی کے ساتھ حسرت کا ایسا پُر درد نقشہ کھینچا ہے جس سے بہتر اور جس سے زیادہ پر اثر اردو کی نظموں میں آج تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

جہاں کوئی دوسرا جو غم سے پاک ہو کہیں تو ہم تم اس جہان سے نکل چلیں یہیں یہیں
یہاں ہزار آفتیں۔ انھیں میں دل گھرا کریں یہاں ہزار گردشیں انھیں میں سر پھرا کریں
وہ ملک چل کے ڈھونڈ لیں جہاں نہ آسمان ہو جہاں نہ اسکے ظلم سے مصیبتوں میں جان ہو
جہاں ہوا چل کہ دم سکا، اُس کا داغ دے سکے جہاں زمین بھی ہو کہ گور منھ میں لے سکے
جہاں نہ کوئی فکر ہو نہ کچھ بھی ہو نہ پیاس ہو جہاں نہ میں اداس ہوں جہاں نہ تم اداس ہو

یہ قدرت کلام اور ایسے دل کو ہلا دینے والے پُر تاثیر مضامین جو سلاست بیان کے ساتھ حضرت انسان کے خیال کو مسخر کرکے اپنی جانب کھینچ لیں، نی زمانہ حضرت شوق قدوائی ہی کے قبضے کی چیزیں ہیں۔

عورت نے خط میں لکھا تھا کہ بے ساختہ میرے آنسو ٹپک پڑے اور خط کے حرف بگڑ گئے میں مجبور ہوں۔ شوہر کس لطیف شعر سے جواب دیتا ہے ؎

تمھارے آنسوؤں کے داغ خط میں جس جگہ پڑے وہ خط سے میرے دل میں آ کے داغ بنکے رہ پڑے

میں کہتا ہوں کہ اس سے بہتر شعر اس موقع کے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھیے سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ لیکن اپنی فصاحت اور ترکیبوں کی لطافت سے شعر سہل ممتنع کی تعریف میں داخل

ہو گیا۔ خوبی بالائے خوبی یہ کہ چند مختلف مطالب کو صرف ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ اگر زبان اور کلام پر قدرت کاملہ نہ ہوتی تو یہ مطالب بجائے ایک شعر کے چند اشعار میں ادا ہو سکتے۔

عورت نے مصائب سے تنگ ہو کے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اب میں زندگی سے در گزری موت کی تمنا کروں گی۔ فطرت انسانی کا عام اور خیالات نسوانی کا خاص شیوہ ہے کہ رنج و غم کی کثرت اور مصائب کے ہجوم سے مجبور ہو کے حیات کو مصائب کا ذریعہ قرار دے کے اس کی تمنا ظاہر کی جاتی ہے۔

مرد نے کس لطیف اور فصیح پیرائے میں دعائے درازی عمر کے ساتھ عورت کو جواب دیا ہے

تمھاری عمر ہو دراز اجل کا نام چھوڑ دو — لحد کے منہ میں خاک منہ سے یہ کلام چھوڑ دو

"لحد کے منہ میں خاک" اس پر لطف محاورے نے جو لطافت اس شعر میں پیدا کی ہے قابل لحاظ ہے۔

عورت نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ تم میری لحد پر آ کے سبزے کو دیکھنا وہ نرم اور ہرا ہے۔ سوکھ کر خار اور مجھ پہ بار ہو جائے۔ وفادار مرد نے کس مزے کا جواب دے کے اس کے خیال کو کدھر سے کدھر پھیرا ہے۔

ہوا لحد کے سبزے کی پھرے نہ پھر دماغ میں — ہے سبزہ نرم اور ہرا تمھارے خانہ باغ میں

یہ خانہ باغ کی جانب انتقال ذہنی شاعر کی کمال معنی آفرینی کی صاف شہادت ہے۔ معمولی شاعر کا دماغ ایسے مقامات تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لطیف تخیل کے علاوہ یہ شعر اول سے آخر تک دلچسپ محاورات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

چونکہ عورت شکستہ دل ہے اب مرد کو اس امر کا یقین دلانے کی ضرورت ہوئی کہ وہ اسے بھولا نہیں ہے اور اسکی محبت کو دل و دماغ میں جگہ دیے ہوئے ہے۔ ان مطالب کو وہ جن فصیح اور دل آویز الفاظ میں جن الفت خیز خیالات کے ساتھ ظاہر کرتا ہے، یہ خوبیاں حضرت شوق قدوائی ہی کی سخن سنجی کے قبضۂ قدرت میں ہیں دوسرے کو حاصل نہیں ہے

نہ بھولنے کی تم ہو نہ تم ہو چھوٹنے کی شے   قسم خدا کی تم ہو دل میں اور دل بغل میں ہے

نظر میں حسب کے نور بن کے تم مری نظر میں ہو   جمال بنکے دل میں ہو خیال بن کے سر میں ہو

پہلے شعر میں دوسرا مصرع بلاغت معنوی سے لاجواب ہے اور دوسرے شعر میں تینوں ٹکڑے ہیں سب جواہر کے ٹکڑے ہیں۔

شوہر نے عورت کی محبت کو اپنے جذب قلبی کے ساتھ ظاہر کر کے اسکی یاد کو تازہ رکھنے کی جو تصویریں کھینچی ہیں، یہ اردو کی شاعری میں حضرت قدوائی کی سحر البیانی کے سوا اور کسی کے قلم سے کھینچی ہوئی نظر نہیں آئیں۔ گویا فطرت کے مجسم نقشے نہایت خوشنما اور دلفریب لباس میں پیش نظر ہیں۔ وہ یاد دلانے والے نقشے حسب ذیل ہیں مگر صرف یاد کے متعلق بہت سے اشعار ہیں۔ میں چند اشعار تحریر کرتا ہوں ؎

تمھاری مسکراہٹوں کو یاد کر رہا ہوں میں   کھلیں نہ دانت اس ادا پہ صاد کر رہا ہوں میں

یہ ادائے خاص اور پھر لطف قافیہ دونوں قابل صاد ہیں۔

وہ بال کھولکر کبھی جھٹک کے سر کو تھامنا   لچک پڑے بدن تو پھر لپک کے در کو تھامنا

* عورتوں کی عادت ہے کہ سر کے بالوں کو کھول کے انکے پیچ کھولنے کو ہاتھوں سے جھٹک دیتی ہیں

اس ادا کے ساتھ عورت کی فطری نزاکت کو کس لطف سے دکھایا ہے۔ یعنی جھٹکے سے سر کو صدمہ پہنچا تو سر کو تھام لیا اور جھٹکے کی حرکت سے (نازک) بدن لچکا تو لپک کے در کو تھام لیا۔

اس فصاحت، اس لطافت، اور ایسی فطری حالتوں کو اس نزاکت اور اس قدر پاکیزہ ترکیب کے ساتھ ایک سیدھے سادے الفاظ کے شعر میں بیان کر دینا حضرت شوق قدوائی کی سحر البیانی اور انتہائے قدرت کلام کی واضح دلیل ہے۔ گویا زبان پر ایسا مستحکم قبضہ ہے کہ جس ادا پر خیال کیا اُسکی پوری شبیہ نظم سے پیش کر دی ؎

گلوریوں کی صورتیں وہ خوشنما نئی نئی سپید پان اوپر اور اندر اس کے بستی

یہ لکھنؤ کی گلوریاں ہیں۔ بستی پان لکھنؤ میں وہ کہے جاتے ہیں، جو نہت ہرے ہوں نہ بہت سپید۔ خوش مزہ ہونے کے سبب سے عمائد میں انھیں کا رواج ہے۔ مگر گلوریوں کی خوبصورتی کے لیے ایک پان بہت سپید اوپر رہتا ہے۔ شاعر نے کس فصاحت سے ان گلوریوں کی اصل دکھائی ہے ؎

وہ ہار مجھکو یاد ہے کہا تھا دیکھکر جسے ہیں موگرے کے پھول کم بہنیں بہنتی ہیں آ کے

کرخت بو ہے۔ سر میں درد ہوگا۔ دو۔ رڈال دو نہیں تو کامنی کے پھول۔ چُنکے تم نکال دو

کیا اس سے زیادہ زبان کی فصاحت اور ترکیب سخن کی لطافت کے ساتھ نازک دماغ عورت کی فطری حالت کا اظہار سوا حضرت شوق قدوائی کے اور کوئی شاعر نظم سے کر سکتا ہے؟ اس وقت تو ہندوستان میں اور کوئی نظر نہیں آتا آئندہ کا حال خدا جانے

موگرے کے پھولوں کی خوشبو ہلکی ہوتی ہے اور کامنی کے پھولوں کی بو کرخت۔ عورت کی فطری نزاکت کے ساتھ ان پھولوں کی فطرت حالت بھی دکھا دی۔ دوسرے شعر کے ٹکڑے ایسے زینے ہیں، جو سخن کو عرش معلّٰی پر لے گئے سبحان اللہ سبحان اللہ ؎

نہ ہی کریپ سے وہ چڑھ کہ چبھتی ہے وہ خارسی ۔ پسند صرف ململ اور گلبدن بنارسی

ہارسے دماغ کی نزاکت کا اظہار تھا؛ اور زری کریپ سے جسم کی نزاکت کا۔ اس شعر کے مصرعہ دوم کا قافیہ کیا لطف دے رہا ہے۔

اب چوڑیوں سے ہاتھوں کی نزاکت دکھائی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ ذیل کے دونوں اشعار موتیوں کی دو لڑیاں ہیں ؎

وہ چوڑیوں کا پھیرنا کہا تھا دیکھ کر جنھیں ۔ چبھینگے انکے گوکھرو نہ پہنوں گی کبھی نہیں

کھو بدل کے لائیں ایسی چوڑیاں بڑے میاں ۔ کہ تین تین بانکیں۔ چار چار ہوں کریلیاں

لکھنؤ میں گوکھرو کی چوڑیاں بہت خوشنما اور قیمتی بنتی ہیں لیکن اُن کے گوکھرو ٹوٹ ٹوٹ کے ہاتھوں میں چبھتے ہیں۔ اسی سبب سے نازک مزاج عورتیں نہیں پہنتیں۔

پہلے شعر سے اُن چوڑیوں کی حالت دکھائی گئی ہے، اور دوسرے شعر سے سادگی کی ادا ظاہر کی گئی ہے۔ یعنی صرف بانکیں اور کریلیاں جو اپنی سادگی سے نزاکت کے لیے موزوں ہیں۔

"بڑے میاں" کے الفاظ جو لطف دے رہے ہیں زباں داں ہی اسکو سمجھ سکتے ہیں ایک عورت کی زبان سے یہ الفاظ کس قدر زیبا ہیں اور معمولی بول چال کا بے تکلفانہ مذاق کس

خوبی سے ظاہر کر رہے ہیں۔ قلم سے اسکی تعریف کہاں تک کی جائے۔ نگاہیں دیکھیں اور دل لطف اُٹھائیں۔

بانکیں وہ چوڑیاں ہیں جن میں لہر ہوتی ہے، اور کریلیاں وہ ہیں جن میں لہر نہیں ہوتی۔ بیچ میں بانکیں اور ادھر اُدھر کریلیاں پہنی جاتی ہیں۔ تین تین اور چار چار کی تکرار سے دونوں ہاتھوں کی چوڑیوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ چونکہ عورتیں ہمیشہ طاق کا شمار چوڑیوں میں رکھتی ہیں، اس وجہ سے سات سات چوڑیاں دونوں ہاتھوں کے لیے چاہی گئی ہیں۔ اللہ رے قوت بیانیہ! زباندانان ذی فہم اس لطیف بیان کا اندازہ فرمائیں کہ نظم کیا ہے گویا نثر میں بات چیت ہو رہی ہے۔

اب شوہر ایک اور دلچسپ واقعہ کو یاد کرتا ہے ؎

گرا زمرّد ایک شب جو ٹوٹ کر بلاق سے   تم اُسکو ڈھونڈھنے لگیں چراغ لیکے طاق سے

یہ تخیل جو رُخ بدل کے ایک واقعہ کی جانب پھری ہے کمال شاعری پر دال ہے۔ واقعہ کی تصویر کیسی عمدہ اور کس لطیف اصلیت کے ساتھ کھینچی گئی ہے۔ طاق کا قافیہ کتنا نفیس اور چراغ کی ضرورت سے کیسا لپٹا ہوا ہے۔ یہ سخن سنجیاں لاجواب اور یہ فطری ادائیں بے مثل ہیں۔ زبان ہے کہ چلتا جادو!

اب شوہر شایستگی کے ساتھ عورت کی طنزیہ نوک جھونک کا جواب دے کے قسموں کے ساتھ اپنی محبت اور وفا کا اُسکو یقین دلاتا ہے۔

قسمیہ اشعار بہت ہیں، اور نہایت لطیف لطیف ہیں۔ مگر میں بخوف طوالت چند اشعار لکھ کے ارباب فہم کے فصاحت پیرا خیالوں اور بلاغت سنج دماغوں کے سامنے پیش کرتا ہوں ؎

قسم تمہاری پتلیوں کی جن کی ہر نظر بلا
قسم تمہارے ابرؤوں کی جن کے بس میں کربلا

قسم تمہارے دل کی جس میں بارہا پھرا ہوں میں
قسم تمہارے دوستوں کی جن میں اب گھرا ہوں میں

قسم تمہارے اس سخن کی طرز جسکا کام ہے
قسم تمہاری اس چھری کی ناز جسکا نام ہے

قسم تمہاری اس ہنسی کی جس سے گل کھلا کرے
قسم تمہاری اس زباں کی مجھ سے جو گلا کرے

قسم شکن کی جو جبیں پہ ناز اسکو ڈال دے
قسم صدا کی بات کو جب اُنہ کے ساتھ ٹال دے

قسم ہے بے رخی کی جسکو پھیر کے رُخ عیاں کرے
قسم ہے خامشی کی جسمیں نگاہ کچھ بیاں کرے

ایسی نازک خیالیوں کی دلفریب نظمیں، اُردو میں اب تک تو نظر نہیں آئی تھیں۔ ہاں! اب جناب شوق قدوائی کی طباعیوں اور جدّت آفرینیوں نے قوت بیانیہ کے اعجاز سے شاعری کے جسم مردہ میں نئی جان ڈالی ہے، اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اگر زبان اُردو میں کمال اور قوت مقال حاصل ہے، تو مشکل سے مشکل مضامین اور نازک سے نازک خیالات کو فصاحت کے ساتھ نظم کر دینے کے لیے الفاظِ اُردو میں کافی وسعت موجود ہے۔

"ریویو" طویل ہو گیا۔ اگرچہ نظم کی وسیع خوبیوں کے سامنے ابھی مختصر ہی ہے، خیر، اب میں درمیانی اشعار کو چھوڑ کے اصل نظم سے متعلق آخر کا ایک لاجواب اور لاثانی شعر لکھ کے اس ریویو کو ختم کرتا ہوں۔

عورت نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ گھر میں انار کا پیڑ ہے اور اس پر ہر روز پپیہے آتے ہیں۔ وہ مجھ پر ترس کھا کے اور مجھے شرم سے چپ پا کے تم کو (یعنی شوہر کو) پکارتے ہیں (یہ مطلب "پی کہاں" کی آواز سے ہے) شوہر نے جواب میں لکھا ہے

پپیہے خوش رہیں کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں   جو آپ کہیں وہ پی کہاں "تو ہم کہو کہ آتے ہیں

شوہر کی آمد آمد سے عورت کو تسکین دینے والا شعر اور پپیہوں کے استفسار کا جواب کیا اس سے زیادہ لطیف، فصیح، دلچسپ اور پُر اثر ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں! مصرعہ ثانی کا آخری ٹکڑا اس قدر لطیف ہے جس نے شعر کو اوج کمال پر پہنچایا ہے۔

اب میں ریویو کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ حضرت منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کی عمر میں برکت دے، اور ہمیشہ نظر بد سے اُن کو محفوظ رکھے۔ اُن کی بدولت سرزمین سخن پر ایسے گراں بہا موتی بکھر رہے ہیں جن کو اربابِ فہم و اصحاب مذاقِ لطیف کی نگاہیں شوق سے چن رہی ہیں۔

سید مقصود علی اسیوانی

چوتھا رُخ

شوہر نے خط میں لکھا تھا کہ میں بیسویں دن آؤں گا، آج بیسواں دن ہے عورت انتظار میں اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے

خط کو ہے بیسواں دن آج آئینگے "وہ" ضرور ہی
کیا میں کھنچی ہوئی رہوں "اُن" کی نظر سے دُور ہی

"اُن" کی صدا سُنے تو پھر ہو نہ سکے جگر سے صبر
پاکے "اُنھیں" کبھی نہو ترسی ہوئی نظر سے صبر

کیا میں جگر کو تھام لوں، کیا میں نظر کو پھیر لوں
کیا "وہ" اُدھر سے آئیں تو رُخ میں اِدھر کو پھیر لوں

"اُن" کی کشش میں آکے رُخ پھِر نہ سکے تو کیا کروں
دل سے کروں تو زور میں دل جو جھکے تو کیا کروں

اور اگر نہ آئے "وہ" ہائے یہ شک ستم کا ہے
آ مرے دل میں اُو امید وقت ترے کرم کا ہے

شک سے پڑی میں سوچ میں ڈرتی ہوں یاس آ نہ جائے
اُس سے چڑھی ہوئی ہوں میں "وہ" مرے پاس آ نہ جائے

آتے ہی یاس کا خیال کانپ اُٹھی ہوں ڈر کے میں
ڈر نہیں دل میں ورنہ آج بیٹھتی بند کر کے میں

یاس سے ہوں جلی ہوئی اُسکو میں جھونکوں بھاڑ میں
ہٹ مرے دل سے او شک آج یاس ہے تیری آڑ میں

آئیں گے یا نہ آئیں گے، دل مرا کاش بول دے ‌ ‌ ناخن اگر بنے، تو یہ شک کی گرہ کو کھول دے

بول اُٹھا وہ میرا دل کہتا ہے آ رہے ہیں "وہ" ‌ ‌ میرے لیے بہت سا چین تحفے میں لا رہے ہیں "وہ"

دیکھ رہی ہوں آرسی، چہرے پہ رنگ آ گیا ‌ ‌ دل نے کیا ہے سُرخ رو، ورنہ کہاں سے پا گیا

دل کو ملا کہاں سے رنگ، اسکو ملا امید سے ‌ ‌ پائے گا یہ کچھ اور بھی، آج ہی "اُن" کی دید سے

کل مرے سر میں تھا جنون آج ہے کچھ غرور سا ‌ ‌ کل مرے دل میں تھا ملال، آج ہے کچھ سرور سا

اپنے لبوں پہ بار بار، پاتی ہوں میں تبسم آج ‌ ‌ خوش ہو اے مرے لبو کہتے ہو "اور کچھ" تم آج

گھر کی زمین جاگ اُٹھی، صحن پہ نور چھا گیا ‌ ‌ آئیں گے "وہ" ضرور ہی مجھ کو یقین آ گیا

ناچ رہا ہے خوب آج، سُن کے ہوا ہے مور خوش ‌ ‌ اس کو بھی مل گئی خبر، پھرتا ہے کیا چکور خوش

آ کے پپیہے پیڑ پر اب جو کہیں گے "پی کہاں" ‌ ‌ اُن سے کہوں گی ہنس کے میں، بیٹھے ہیں میرے پی یہاں

دل تو خفا نہیں مگر، میری نظر جھکی رہے ‌ ‌ بعد کو بات چیت ہو، پہلے زباں رُکی رہے

پا کے "اُنھیں" رُکے زباں، اُسمیں کہاں یہ ضبط ہے ‌ ‌ اسکو تو بول چال میں اُن کی زباں سے ربط ہے

ہنسنے کو میں ہنسوں مگر، ہنس بھی سکوں گی یا نہیں ‌ ‌ تھمنے کو میں تھموں مگر تھم بھی سکوں گی یا نہیں

بن کے شگفتگی خوشی، رخ سے جو کھل پڑے اِدھر ‌ ‌ لطف کے ساتھ کر کے میل اُنسے نظر لڑے تو پھر

ہونٹ تو میرے بس کے ہیں، انکو سکھاؤں ڈھنگ میں ‌ ‌ لیکن اُڑاؤں کس طرح رُخ سے خوشی کا رنگ میں

ترسی ہوئی ہیں پتلیاں، چین سے کب یہ رہ سکیں ‌ ‌ شوق سے بیقرار ہوں، گرچہ یہ کچھ نہ کہہ سکیں

دل یہ کہے گا میل کر، لب یہ کہیں گے بول دے ‌ ‌ حُسن کہے گا ہاتھ سے، تو مرے رُخ کو کھول دے

آپ ہی بڑھ کے چلیں گے پاؤں، آ وہ گئے جب کے سامنے ‌ ‌ لائیں گی شوخیاں مجھے گھونگھٹ اُلٹ کے سامنے

مشکل کشش کی بن پڑی، دل کو جو روک تھام لوں — صبر کی دل میں ٹھان لوں جبر سے دل پہ کام لوں

بن کے بلا میں اُن کے سر آج پڑوں ضرور ہی — دل میں ہنسا کروں مگر منہ سے لڑوں ضرور ہی

خط میں گلے میں لکھ چکی، اور گلوں میں لطف ہے — ہوگی مزے کی نوک جھونک گرچہ دلوں میں لطف ہے

آنکھ مری جو اُٹھ ہی جائے جلد نظر کو پھیر لوں — صرف نظر ہی کو نہیں بلکہ میں سر کو پھیر لوں

آئیں جو رخ کی سمت "وہ" ہاتھوں سے منہ چھپاؤں میں — جھانک کے انگلیوں سے ہاں دیکھوں جو دیکھ پاؤں میں

دانت سے دبائیں گے تاکہ رہے زبان بند — کچھ "وہ" کہیں تو انگلیاں اُٹھ کے کریں گی کان بند

ایک پلک سے دوسری تہہ رہے ملی رہے — جیسے انار کی کلی سوکھ کے بے کھلی رہے

نیچے کے لب پہ دانت ہوں اور نظر زمیں پہ ہو — ہاتھ مرے جگر پہ ہو اور شکن جبیں پہ ہو

میرے لبوں پہ گر ہنسی آئے گی چھپاؤں میں — ہاتھ میں لے کے پنکھیا منہ کو کروں گی آڑ میں

لب نہ ہلیں خدا کرے میں جو انھیں ہلاؤں بھی — "اُن" سے ملیں نہ چتونیں میں جو انھیں ملاؤں بھی

سر کو جو میں اُٹھاؤں بھی تو نہ اُٹھے جھکا رہے — دل کو جو میں بڑھاؤں بھی تو نہ بڑھے رکا رہے

کچھ جو "وہ" دیں تو یوں نہ لوں لوں تو نہیں نہیں کے بعد — لاکھ رکاوٹوں کے بعد لاکھ چناں چنیں کے بعد

یوں اُٹھوں تو میں جدا اُن سے روش زبان کی — وہ جو کہیں زمین کی میں کہوں آسمان کی

"وہ" مرے خط کی چٹکیاں یاد دلائیں گے مجھے — چھیڑنے کو ہنسیں گے خود اور ہنسائیں گے مجھے

مکر سے بدگماں بنوں اپنی ہی رکھوں ٹیک میں — لاکھ نہیں نہیں کریں اُن کی نہ مانوں ایک میں

دل جو نہ مانے تو انھیں ترچھی نظر سے دیکھ لوں — یا سے کواڑ میں دراڑ جا کے اُدھر سے دیکھ لوں

مجھ سے "وہ" مانگیں ہاں نہیں دوں گی ضرور پان میں — پھیر کے منہ بڑھا دوں گی ہاتھ سے خاصدان میں

میری دعا کے جال میں کیا "وہ" الجھ ہی جائیں گے　صاف ہیں لگی عورتیں یہ "وہ" سمجھ ہی جائینگے
آئی لبوں پہ "وہ" ہنسی، یہ کہیں اور ہنسائیں تو　لاکھ دباؤں میں مگر لب مرے کھل ہی جائیں تو
دلمیں جو گدگدی سی ہو، رک نہ سکے کبھی ہنسی　باتیں ہی یہ ہنسی کی ہیں، آنے لگی ابھی ہنسی
اُف، مجھے اسکا سچ کیا، دلمیں تو رنج ہی نہیں　اپنی وفا کو چھوڑ دے دل مرا ایسی شے نہیں
دل میں بسے ہوئے ہیں "وہ" اسمیں خیال انھیں کا ہے　دل مرا ہے وہ آئینہ جسمیں جمال انھیں کا ہے
پھیلے ہیں روح بنکے وہ میرے تمام جسم میں　میری حیات ہیں "وہی" جان ہے نام جسم میں
او مرے دل کشش کچھ اور، تا کہ "وہ" کھنچکے آہی جائیں　ہیں انھیں جلد پا ہی جاؤں "وہ" مجھے جلد پا ہی جائیں
جنگ کو ہو رہی ہے دیر اور وہ مرنے کی بات ہے　دیکھو لیجائے نا رہے حسن کی یہ بھی گھات ہے
اب تو یہ فکر ہے کہ آج کچھ تو سنگار چاہیے　ٹوٹ گیا ہے کل "بلاق" سونے کا تار چاہیے
شوق کے پاس بھیجدوں ایک ذرا سا تار کیا　دام نہ لیں "وہ" تو نہیں تار کا ایسا بار کیا
ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں کم ٹوٹ گئے کڑے کبھی　آئیں گے آپ تو مرے میاں اُنسے منگاؤنگی نئی
مجھ کو بھی سادگی پسند، انکو بھی سادگی پسند　پہنوں سپید ہی لباس ہوگا انھیں یہی پسند
بیلیں ہوں یا ہوں بوٹیاں جیسی ہوں کام کی بنیاں　چند وہ سیتے پھاڑ لوں رکھی ہیں جو ابھی نیاں
بیل کناری کی ابھی چوک سے میں منگا نہ لوں　لائی ہے اچھی ایک بیل اسکو بھی لوں میں پانہ دیں
بیل چکن کی ہے مگر کچھ بھی نہیں دُھلی خراب　ایک تو شربتی بُری، دوسرے تیسری بھی خراب
کس سے منگاؤں بیل میں سب سے خفا ہیں وہ آج　لڑکے گئے دلہن سے وہ بگڑے ہوئے ہیں تیور آج
کیوں نہ کہوں لوا سے میں خود وہ بناتی ہیں کناری　چوک سے لیتی آئے وہ جائے جو لینے نان باؤ

ہار میں گوندھ لوں، اگر پھول ہوں خانہ باغ میں
اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلا نہ باغ میں

ہو ہی رہے گا یہ تو سب، مجھکو خیال ایک ہے
ساس "چپ" او "زبان چپ" نند ضرور نیک ہے

اُس کی سسی پِس کی گانٹھ اور کوئی نہ ہوگی شہر میں
رکھی ہے منھ میں اک چھری اُسنے بجھا کے زہر میں

جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گرم دو توے
خود تو ہے "مسن" اور دانت جیسے چھلے ہوے جوے

دیکھ کے یہ چمک دمک وہ مرے روپ سے جلے
ریت میں کوئی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے

آج مجھے بھی ہے گھمنڈ، طنز کا کچھ بھی غم نہیں
اُسکو جو ہے "کسی" پہ ناز، میں بھی کچھ اس سے کم نہیں

لیتی ہے دلمیں چٹکیاں کرتی ہے دل کا خون وہ
لاتی ہے گھر سے اپنے ساتھ، میرے لیے جنون وہ

لے لو "حضور" آگئے تب ہی سنورتی ہی رہی
بن نہ پڑا سنگار کچھ، حوصلہ کرتی ہی رہی

چوتھے رخ پر ایک نظر

"عالم خیال" کے نام سے مسلسل چار نظمیں منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کی تصنیف کی ہوئی مختلف رسالوں میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ جنکو ایک ہی زنجیر کی چار کڑیاں کہنا زیبا ہے یہ لاجواب نظمیں اگر کسی ایک ہی رسالے کے حصے میں پڑی ہوتیں، تو طالبان سخن کو جستجو کی دشواری نہ پیش آتی، جن کی نگاہیں ایک نظم کو دیکھکر بے تابانہ سب نظموں کی جویا ہوتی ہیں۔

حصۂ اول پر مسٹر مشیر حسین قدوائی، بیرسٹرایٹ لا نے؛ حصۂ دوم پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا نے، اور حصۂ سوم پر سید مقصود علی صاحب (اسیونی) وکیل نے ریویو تحریر فرمایا ہے۔ ہر ریویو اپنے حصۂ نظم کی شاعرانہ خوبیوں اور اسکے لطیف جذبات کا معقول شارح ہے؛ اور اشعار کے ربط باہمی کو آشکارا کرکے ہر طرز بیان کی ضرورت کو عالم خیال سے عالم ظہور میں لا رہا ہے۔

دو قابل بیرسٹروں کے نظارے معمولی نہیں ہیں۔ انکی وسیع نگاہیں انگریزی کے مذاق فطری اور جذبات انسانی کو اپنے دماغوں اور دلوں میں مجتمع کئے ہوئے ہیں اور اُن کے فلسفیانہ خیالات کی جولانیاں فلسفۂ اخلاق و معاشرت کے مراحل کو طے کر چکی ہیں جن کا

میدان بہ نسبت اُردو فارسی کے انگریزی علم ادب کی قلمرو میں وسیع تر ہے۔ لہذا نظموں کی ان خوبیوں پر جو فیصلے ان دونوں کے ہیں ناطق ہیں۔

ہر چند قابل بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں کہ ایسے جذبات کی مسلسل نظمیں انگریزی میں بھی نہیں ہیں، اور ہر سہ ریویو نگار تسلیم فرماتے ہیں کہ اُردو میں اس قسم کی دلفریب نظموں کے موجد حضرت شوق قدوائی ہی ہوئے ہیں جنھوں نے فصیح زبان لطیف بیان، فطری جذبات، اخلاقی خیالات اور ایشیائی طرز معاشرت کی دلکش اداؤں کے ساتھ عفّت مآب عورتوں کے جذبات دل کو اس طرح دکھا دیا ہے کہ گویا زندہ صورتیں پیش نگاہ ہیں۔ آج یہ کمال سخن سرائی حضرتِ شوق قدوائی ہی کی ذات پر منحصر ہے، اور بس۔

اب مجھے ان ہر دو امور پر بجز اس کے اور کچھ رقم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں قابل ریویو نگاروں سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔

جذبات انسانی اور فطری ہیجان طبعی پر فلسفیانہ اور سخن سنجانہ بحث فاضل بیرسٹروں نے ایسی قابلیت اور ماہیت کے ساتھ کی ہے۔ نیز مذاق سخن اور اسکے نکات کو انھوں نے اور پھر حضرت وکیل نے اس قدر خوبی اور پُر تجربہ دلائل کے ساتھ دکھایا ہے کہ اس صنف پر بھی گنجائش تحریر زیادہ نہیں باقی رہی۔ البتہ صرف ایک امر زمانہ حال کی سخن سرائی پر غور طلب ہے وہ یہ کہ قدیم طرز سخن اور جدید طرز سخن دونوں کی صورتیں اس وقت بگڑی ہوئی کیوں ہیں؟ میری رائے میں مطابع کی زیادتی اور رسالوں کی کثرت سے ذرائع اشاعت میں آسانی ہوئی تو ناواقفانِ فن سخن سرا بن گئے۔ رسالوں کے ایڈیٹروں میں یا تو سخن سنج اور سخن فہم

کم ہیں، یا صنفے بھرنے کو اگر ہے تو یہی سامان ہے۔ کریں کیا؟ لیکن بجز از اغلاط اور اصول علم و فن سے متجاوز نظموں کے شائع کرنے سے بجائے بہبودِ اُردو کے خرابی کے اسباب مہیا کیے جاتے ہیں۔

اگر کبھی حشر قدنی ہے اور ہر شے یا رائے سخن پائے گی تو زبان اُردو اور فن شعر کے خونِ ناحق کا محاسبہ انھیں حضرات سے ہوگا جو اغلاط اور بے اصولی سے ان کے گلوں پر جہل کی چھریاں بے رحمانہ پھیر رہے ہیں۔

خیر وہ ہزار مخرب ہوں، فن اُنکے زائل کرنے سے زائل نہیں ہو سکتا۔ سرزمین فن و سخن پر جناب شوق قدوائی کے سے یکتائے فن و سخن موجود ہیں، خدا عمر میں بہت برکت دے، جن کی سحر بیانی نے "حسن" اور "عالم خیال" نیز اور بہت سی فطری مذاق کی بے مثل اور لاجواب نظموں سے، سخن پرست دماغوں اور نگاہوں کو منور کر دیا ہے۔

اب میں ان مباحث سے رُخ کو اصلی نظم یعنی عالم خیال کے چوتھے رُخ" کی جانب پھیرتا ہوں جس کی لطافت اور خوبی بیان کی نزاکتوں نے میرے دماغ اور دلکو گرویدہ کر لیا ہے۔

شوہر نے خط میں لکھا تھا کہ میں آج کے بیسویں دن آؤں گا۔ آج بیسوان
دن ہے عورت انتظار میں اپنے خیالات کے ساتھ باتیں کر رہی ہے:-

خط کو ہے بیسواں دن آج آئینگے وہ ضرور ہی کیا میں کھنچی ہوئی رہوں اُن کی نظر سے دور ہی

لفظ "ضرور" پر "ہی" کا زور دے کے عورت نے اپنے یقین کو شوہر کے آج آنے پر مستحکم کر لیا۔ اب مصرعۂ ثانی کی بنیاد "عالم خیال" کے دوسرے رخ پر ہے۔ وہ عورت کا حسرت ناک خطاب ہے

جس میں وہ بہت سے شکوے اور طنز آمیز گلے شوہر کو تحریر کر چکی ہے۔ اس وقت سوچتی ہے کہ کیا میں اُن شکووں کی بنا پر شوہر سے کچھ اظہار کشش کروں اور دور رہوں۔

اس خیال کے ساتھ ہی جوش محبت نے جو باعصمت عورات کا خاصہ ہے، اس کے دل کو تمنا کی جانب پھیر دیا۔ اور وہ اپنے خیال سے یوں اظہار مجبوری کرنے لگی ؎

"اُن کی صدا سُنے تو پھر ہو نہ سکے جگر سے جبر پا کے" انھیں "کبھی نہ ہو ترسی ہوئی نظر سے صبر

باعفت عورت جو مصائب ہجراں میں سالہا سال مبتلا رہی ہے۔ یہ شعر اُسکے جوش تمنا کی سچی حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ "ترسی ہوئی" کے الفاظ نے اور بھی تمنا کو قوت دی ہے۔

عورت نے پھر اپنے دل سے ایک ایسا سوال کیا ہے۔ اور پھر ہی ایسا جواب دیا ہے کہ دونوں کا لطف میرے دل کو جنبش میں لا رہا ہے یعنی دل وجد کر رہا ہے۔ پہلا شعر سوال ہے اور دوسرا شعر جواب ؎

کیا میں جگر کو تھام لوں۔ کیا میں نظر کو پھیر لوں کیا "وہ" اُدھر سے آئیں۔ تو رُخ میں اِدھر کو پھیر لوں
انکی کشش میں آ کے رُخ پھر نہ سکے تو کیا کروں دل سے کروں تو زور میں دل ہی جھکے تو کیا کروں

واہ! جناب شوق!! سبحان اللہ!!! شعر کیا ڈھلے ہیں، منہ سے موتی اُگلے ہیں۔ میری عمر کا زمانہ بھی اشعار کو دیکھتے ہی گذرا ہے لیکن ایسے فصیح اور دلکش اور بار دا شعار جنہیں فطری اداؤں کے ساتھ جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہوں، سوا ان نظموں کے نہ آج تک دیکھے نہ سُنے۔

شعر اول اپنے مصرعہ اولیٰ سے کن فصیح اور سلیس الفاظ میں ارادۂ ضبط اور اس کی صورت کا اظہار کر رہا ہے، اور مصرع ثانی اِدھر اور اُدھر کے الفاظ سے آنے اور رُخ پھیرنے کی کیفیت لا دینا

اداائیں دکھا رہا ہے

دوسرے شعر کی رفعت نے عرش معلٰے سے ٹکر کی ٹھرادی یمصرع اولیں جس کشش سے رخ کے نہ پھر سکنے کا اظہار کر رہا ہے، اس کا لطف اصحاب معنی فہم کے قلوب اثر پذیر سے پوچھا جائے۔ مصرعٔ ثانی نے اور بھی قیامت کردی۔ فرقت زدہ کا دل جو ناتوان ہو رہا ہے اُس کا زور کرکے تھک جانا یہ ایسا حُسن بیان ہے کہ اس سے بہتر اس موقع کے لیے اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تھکنے کا نتیجہ نکلتا ہے کہ رخ کھنچکے سامنے ہو ہی جائے گا۔

اب بہ مقتضائے فطرت عورت کو وہم نے گھیرا کہ مبادا آج شوہر نہ آئے تو کیا کہتی ہے ؎

اور اگر نہ آئے "وہ" ہائے یہ شک ستم کا ہے   آ مرے دلمیں اے امید۔ وقت ترے کرم کا ہے

شک سے پڑی میں سوچ میں ڈرتی ہوں یاس آ نہ جائے   اُس سے چڑھی ہوئی ہوں میں۔ وہ مرے پاس آ نہ جائے

آتے ہی یاس کا خیال کانپ اُٹھی ہوں ڈر کے میں   دل میں نہ آج بیٹھتی بند کرکے میں

یاس سے ہوں جلی ہوئی اسکو میں جھونکوں بھاڑ میں   ہٹ مرے دل سے او شک آج یاس تیری آڑ میں

شعر اوّل کے مصرعِ اولیٰ میں "ہائے" نے حسرت انگیز خیال میں جان ڈال دی ہے مصرعِ ثانی میں "اُمید" پکاری گئی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس سے ایسی حالت میں قلب حزیں تسکین پا سکتا ہے اُمید کو کرم کا وقت بتایا گیا ہے "وقت" کا لفظ جو یہاں "ضرورت" کے معنی دے رہا ہے اس نے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ شعر دوم میں یاس سے خوف کا اظہار ہے جس کے خیال نے شعر سوم میں وہ لطافت پیدا کی ہے جو باعتبار حالت اور باعتبار سخن سنجی جس قدر مصرع اولیٰ سے صورت حال ہے، اسی قدر مصرع ثانی سے بلند پایہ ہے یہ بیان کہ دلمیں دروازہ نہیں ہے

ورنہ آج میں بند کرکے بیٹھتی تاکہ پاس نہ آسکے" کتنا رفیع مضمون اور کیسا دلفریب ہے شعر چہارم میں جو لطف "جلی ہوئی" اور "جھونکوں بھاڑ میں" ان دونوں محاوروں سے پیدا ہوا ہے جن سے عورت کی بے تکلفانہ بول چال پیش نگاہ ہے، اس لطف کی داد دلوں سے لی جائے۔ اسی شعر کے مصرع ثانی میں شک یہ کہکر بٹھایا جاتا ہے کہ پاس تیری آڑ میں ہے مضمون اور قافیہ دونوں کمال مضمون آفرینی کے قطعی دلائل ہیں۔ معمولی شاعر کا خیال نہ اتنی بلندی تک پہنچ سکتا ہے، نہ اسکی زبان بندش مضمون کے واسطے ایسے فصیح اور سلیس الفاظ پا سکتی ہے۔ یہ قدرت کلام، عورت بیان، اور لطف زبان جناب شوق قدوائی ہی کے مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک ہیں جن میں انھیں کا سکۂ سخن چل رہا ہے، اور بس۔

اس کے بعد عورت نے اپنے دل سے سوال کیا ہے۔ اس کا دل بول اٹھا کہ آرہے ہیں اور بہت سا چین میرے واسطے تحفہ میں لا رہے ہیں۔ یہ معنی آفرینی کے لحاظ سے کیسا نیا، اور واقعے کے اعتبار سے کس قدر دلچسپ تحفہ ہے۔ غالباً جناب شوق قدوائی ہی نے صلاح دی ہوگی کہ ایسا تحفہ لے جاؤ جس کو دل قبول کرے۔ اس لیے کہ سوا ان کے ایسا نکتہ یاب دماغ فی زمانا اور کسی سخن گو کا نہیں ہے جو ایسے تحفۂ لاجواب تک اپنے خیال کو پہنچا سکے۔

عورت کا دل بول کے آنے کی خبر دے چکا، تو اپنے یقین کا استحکام کیسے کیسے مسرت خیز خیالات سے کرتی ہے، اور کیا کیا فرحت انگیز شگون لیتی ہے ؎

دیکھ رہی ہوں آرسی چہرے پہ رنگ آگیا ۔۔۔ دل نے کیا ہے سُرخ رو۔ ورنہ کہاں سے پاگیا

دل کو ملا کہاں سے رنگ، اسکو ملا امید سے ۔۔۔ پائے گا یہ کچھ اور بھی آج ہی انکی دید سے

کل مرے سر میں تھا جنون آج ہی کچھ غرور سا — کل مرے دل میں تھا ملال آج ہی کچھ سرور سا

اپنے لبوں پہ بار بار پاتی ہوں میں تبسم آج — خوش ہو اے مرے لبو۔ کہتے ہو اور کچھ تم آج

گھر کی زمین جاگ اُٹھی صحن پہ نور چھا گیا — آئیں گے "وہ" ضرور ہی مجھکو یقین آ گیا

آرسی میں چہرے کے رنگ کو دیکھ کے کہتی ہے کہ یہ امید سے ملا ہے۔ رنگ امید کو شعرا نے الفاظ میں تو دیکھا ہوگا، مگر جناب شوق قدوائی نے اُسے چہرے پر نمایاں کر دیا۔ گویا یہ رنگ حضرت ہی کے سخن لاجواب کے واسطے وضع کیا گیا تھا۔

شعر سوم میں لفظ غرور جو لطیف اور بلند معنی دے رہا ہے اُسکی داد یارائے قلم سے زیادہ ہے۔ اور اسی کے برابر کا قافیہ سرور ہے، جس کا سرورِ دلِ سخن فہم سے پوچھا جائے عورت کی فطرت کا یہ خاصّہ کہ شوہر پر اس کو گھمنڈ ہوتا ہے، اس فصیح اور لطیف شعر نے ظاہر کر دیا۔

شعر چہارم میں لبوں پر بار بار تبسم کا آنا بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی مسرتِ دلی کی فطری ردِ عمل ہے۔ اسی شعر کے مصرعِ ثانی میں لبوں کی جانب مخاطب ہو کے یہ کہنا کہ "کہتے ہو اور کچھ تم آج" کس قیامت کا ٹکڑا ہے۔ اس کو جواہر کا ٹکڑا نہیں بلکہ دل کا ٹکڑا کہنا چاہیے۔ اور اس کا مزا بھی وہی دل پا سکتا ہے جس کو چاشنی مہر و وفا کے ساتھ چاشنیِ سخن بھی نصیب ہوئی ہو۔ صرف انھیں چھ الفاظ کی شرح لکھنے کا قصد کیا جائے، تو دماغ شش و پنج میں پڑ جائے کہ کہاں تک اظہار مطالب کروں۔

عورت نے شوہر کے آنے کا یقین دل کی شہادت اور شگونوں سے ہر نوع کر ہی لیا۔ اب وہ ان نازوں کی جانب اپنے خیالات کو منتقل کرتی ہے جن کو وہ کلام میں لانا چاہتی ہے

فی الحقیقت قدرت نے عورت کے دل و دماغ کی ترکیب ہی میں نازوں کو داخل کر دیا ہے اور یہی ادائیں ہیں جو حرکات کرشمہ پرداز سے حُسن کو قوت جاذبہ دے کے مردوں کے دلوں پر مقناطیسی کشش کا اثر ڈالتی ہیں۔ کیسی ہی حسین عورت کیوں نہ ہو، اگر اسکی ادائیں دلفریب نہیں ہیں تو قوت جاذبہ نگاہوں سے گذر کر دلوں پر کم اثر انداز ہو سکتی ہے۔ حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے ع

بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

حُسن کا مسئلہ فلسفیانہ ایسا وسیع ہے جس کی تحریر کا یہ موقع نہیں جسکو شوق ہو وہ جناب شوق قدوائی کی مثنوی "حُسن" کو دیکھے جس میں حسن کا وسیع فلسفہ ایسی رنگینی سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا گلہائے رنگا رنگ چمن زار اوراق پر کھلے ہوئے ہیں۔ اور اس مثنوی کے فلسفہ کی تشریح حضرت برق بی اے (آں جہانی) نے دیباچہ میں نہایت معقول کی ہے، جس سے بلیغ مسائل کا فصیح بیانات سے انکشاف ہو گیا۔ ورنہ بہت لوگ مثنوی کو دیکھ کے فہم نکات سے محروم رہتے۔

بہر حال عورت نے قصد کر لیا کہ وہ دلفریب اداؤں کا جال شوہر پر ڈالے گی۔ اب وہ کہتی ہے ؎

دل تو خفا نہیں۔ مگر میری نظر جھکی رہے ۔۔۔ بعد کو بات چیت ہو۔ پہلے زباں رکی رہے

اس کی محبت، وفا، اور سرشت نیک نے اُس سے یہ کہلا دیا کہ وہ دل سے خفا نہیں ہے اگر وہ اس امر کو ظاہر نہ کر دیتی تو ضرور اس کا برتاؤ قابلِ حرف قرار پاتا۔ اس لیے کہ شوہر اپنے

خط میں (جو سلسلۂ عالمِ خیال کا تیسرا رُخ ہے) عورت پر یہ ظاہر کر چکا ہے کہ وہ بمجبوری ایک مدّت دراز تک پردیس میں رہا نہ کہ بہ انداز بے وفائی۔ اور اسی خط میں وہ چند در چند شکلوں سے عورت کی محبّت اور اسکی دل خوش کن یاد کا اظہار کرکے اسکو تشفیاں دے چکا اور یہ عذر تحریر کر چکا ہے کہ آج کے بیسویں دن وہاں پہنچے گا۔

اداہائے دلفریب کا اظہار بہت سے اشعار میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا اب میں جا بجا سے اسکے چند چند اشعار تحریر کروں گا، تاکہ ریویو بہت طویل نہ ہو جائے۔

اب عورت اداہائے ناز آفریں پر خیالات کو یوں دوڑا رہی ہے ؎

بنے کو میں بنوں۔ مگر بن بھی سکوں گی یا نہیں　　تننے کو میں تنوں مگر تن بھی سکونگی یا نہیں

یہ الفاظ نکلے ہیں یا جناب شوق قدوائی کے قلم سے آب حیات کے قطرے ٹپکے ہیں، جو ہمیشہ اُردو کے ادب کو زندہ رکھیں گے۔ عورت اپنے جوشِ محبّت اور ولولۂ تمنّا کا اندازہ کرکے خود کہتی ہے کہ اظہار کشش کا تصنع اس سے بن بھی پڑے گا یا نہیں۔ یہ پس و پیش اُس فطری خیال پر مبنی ہے جو اوہام کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔

اب وہ مسرّتِ قلب سے کششِ مصنوعی کے مغلوب ہو جانے کا وسوسہ یوں ظاہر کرتی ہے ؎

بن کے شگفتگی خوشی رُخ سے جو کھل پڑے تو پھر　　لطف کے ساتھ کرے میل اُنسے نظر پڑے تو پھر

ہونٹ تو میرے بس کے ہیں انکو سکھا دوں جنگ میں　　لیکن اڑاؤں کس طرح رُخ سے خوشی کا رنگ میں

دل یہ کہے گا بس کر لیے یہ کہیں گے بول دے　　حُسن کہے گا ہاتھ سے تو میرے رخ کو کھول دے

شعر اولیں میں شگفتگی کا چہرے سے کھل پڑنا کیا لطف پیدا کر رہا ہے۔ یہ بالیقین فطری مسرت ہے

شعر ثانی میں ہونٹھوں کو تعلیم ضبط مگر رُخ سے رنگ خوشی کے نہ اڑ سکنے پر مجبوری: یہ ایسی شاعرانہ لطافتیں اور نازک خیالانہ مضموں آفرینیاں ہیں جو جناب شوق قدوائی ہی کے دماغ سحر آفریں اور زبانِ سحر البیان کے واسطے اس زمانہ میں مخصوص ہیں۔

اب یہ شعر ملاحظہ ہو جو فصاحت، نزاکت، اور ادائے فطرت کا ایک گنجینہ ہے ؎

بن کے بلا میں اُنکے سر آج پڑوں ضرور ہی   دل میں ہنسا کروں مگر مُنہ سے لڑوں ضرور ہی

بن کے بلا' یہ ٹکڑا قلب اور اشتاش کو جو مزہ دے سکتا ہے، اُسکی حد نہیں بیان کی جا سکتی۔ زبان کیا ہے معدن جواہر ہے۔ مصرعۂ ثانی ہو بہو تصویر فطرت ہے۔ اسکے بعد وہ کہتی ہے ؎

کچھ جو وہ دیں تو یوں نہ لوں۔ لوں تو نہیں نہیں کے بعد   لاکھ رکاوٹوں کے بعد لاکھ چنان چنیں کے بعد

میں کہہ چکا ہوں کہ زبان معدن جواہر ہے۔ یہ "چناں چنیں" کا قافیہ اسی معدن جواہر کا ایک لعل بے بہا ہے۔

بہت سے پُر لطف اور ادا ہائے دلفریب کے اشعار اس موقع پر ہیں لیکن خیال طوالت مانع تحریر ہے۔

اب عورت اس خیال پر مائل ہوی کہ یہ تو جو کچھ ہوگا، ہوگا؟ آج مجھے سنگار تو ضرور کرنا چاہیے کیسا طبعی خیال ہے کہ جو حورات کی سرشت میں گویا ودیعت ہے سنگار کے واسطے طرز شوہر پسند اور اشیاے مناسب کے فراہم کرنے کا انتظام وہ اپنے تصورات سے کرنے لگی ایسی میان میں اسکو ایک خیال نے گھیر لیا، جس کا اظہار وہ یوں کرتی ہے ؎

ہوہی رہے گا یہ تو سب مجھکو خیال ایک ہے   ساس جب اور زبان جب پسند ضرور نیک ہے

اس کے ناقص برتاو پر بے ساختہ اسکی زبان کچھ کہنے کو تھی، مگر بہ پاس ادب اُس نے "چپ اور زبان چپ" کہکر روک دیا۔ فطری بے ساختگی کو لحاظ ادب سے کیا لطیف شکل اور کن عمدہ الفاظ سے روکا ہے کہ سبحان اللہ۔

نند سے وہ بہت جلی ہوئی ہے۔ اس سے اظہار کدورت "ضرور نیک ہے" ان طنزیہ الفاظ سے کیا گیا ہے۔

یہاں نند کی نسبت جو خیالات اُس نے ظاہر کیے ہیں، اس کے دو لاجواب شعر ذیل میں رقم کرتا ہوں ؎

اُسکی سی لیس کی گانٹھ اور کوئی نہ لگی شہر میں — رکھی ہے مُنھ میں اک چھری اُس نے چھپا کے زہر میں

جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گرم دو توے — خود تو ہے لسن اور دانت جیسے چھلے ہوئے چنے

شعر اول میں کا محاورۂ زبان اور اس کے مصرع ثانی کی نفاست بیان اور لطافت معنوی ملاحظہ
شعر دوم میں دونوں گالوں کی نسبت یہ ذہن انگیز مثال کہ جل کے گرم ہوں تو دو توے ہوجائیں قابل داد ہے۔ اور اسی شعر کا مصرع ثانی یعنی دونوں تشبیہات سے لاثانی اور لاجواب ہے یعنی وہ نند، خود لسن ہے اور اس کے دانت چھلے ہوئے چنے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بہتر ہجو اور نہیں ہوسکتی تشبیہات بھی کتنی جدید ہیں چھلے ہوئے کے الفاظ نے چنوں کی زینت کیا دکھا دی۔ دانتوں کے واسطے یہ تشبیہ جدید کس قدر موزوں ہے۔ قدرت بیان، قدرت زبان، قدرت مضمون آفرینی یہ جملہ اصناف سخن سنجی جناب شوق قدوائی ہی کی انتہا کی چیزیں ہیں۔

ذیل میں عورت نند کے حسد کا حاصل ظاہر کرتی ہے ؎

دیکھ کے چمکتے ملک مرے روپ سے جلے　　ریت میں کوئی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے

کیا لطافت اور کیا فصاحت ہے کہ ان دونوں خوبیوں کے لیے یہ نظم سرمایۂ نازش ہے۔ چمک دمک کو دیکھ کے جلنا۔ اے سبحان اللہ مصرع ثانی تمثیل جدید اور لطف بیان کی رفعت پر پہنچ کے عرش معلے سے باتیں کرنے لگا۔ ریت میں جس کی حدت مشہور ہے۔ اس میں جیٹھ (ماہ ہندی) کی دھوپ سے جلنا۔ اللہ رے کلام فصاحت نظام یہ قدرتِ کلام اور قوت زبان ہے جو بیان کو اوج سما پر لیے جا رہی ہے۔ معمولی شاعر کا خیال بھی ریت اور جیٹھ کے الفاظِ لاجواب تک رسا نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد سب سے آخری شعر ہے جو قلب اثر پذیر کے لیے ایک عجیب اور لطیف حیرت انگیز حالت پیش کرتا ہے۔ عورت اپنے منصوبوں ہی میں تھی کہ شوہر آگیا تو وہ کس حسرت مگر کس نفیس پیرایے میں کہتی ہے ؎

لے لو حضور آ گئے بندی سنورتی ہی رہی　　بن نہ پڑا سنگار کچھ۔ حوصلہ کرتی ہی رہی

بندی کا لفظ کیا محاورے کا لطف دے رہا ہے۔ یہ شعر استعجاب، تحیر اور حسرت کی ایسی دلکش تصویر ہے کہ دل بے ساختہ اسکی تاثیر کو قبول کرتا ہے۔

میں نے جس قدر داد دی ہے، یہ ایسی بلند پایہ اور لطیف نظم کو دیکھتے بہت کم ہے، جس قدر اس کی لطافتیں اور کششیں جو فطری جذبات سے بھری ہوئی ہیں، دل کو مسخر کرتی ہیں۔ اسقدر داد دل ہی دے سکتا ہے۔ زبان خامہ مجبور ہے۔ حضرت حکیم برہم نے

بہت صحیح بات تحریر فرمائی کہ جناب شوق قدوائی کے سخن کی داد روح القدس سے ملتی ہے یعنے انسان کے قلم اور زبان سے اس یکہ تاز میدانِ سخن اور سخن گستر سحر البیان کے اصنافِ سخن کی داد پوری نہیں ہو سکتی۔

میں ریویو کو ختم کر چکا۔ آخر میں خدا سے یہ دعا ضرور مانگوں گا کہ وہ جناب شوق قدوائی کو عمر دراز دے اور جسقدر لطف ہم مشتاقانِ سخن کو ان کی لاجواب نظموں سے حاصل ہو رہا ہے اسی قدر لطفِ حیات ان کو حاصل رہے۔ آج ملک ہند میں ایک یہی تو ہیں جن کی سخن سنجیوں کے گلہائے رنگا رنگ سے سرزمین سخن گلزارِ ارشاداب بنی ہوی ہے، اور جن کی باآب وتاب اور لاجواب نظموں کے سلسلے سے عقدِ مروارید کی دولت بے بہا خزینۂ اردو کو حاصل ہو رہی ہے۔

سید شبیر حسن



نومبر سنہ ۱۹۱۳ء

مطبوعہ تھیوسوفیکل پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ

(ڈبلو-ایس میک، ایجنٹ)